دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۹۲	صفر المظفر ۱۴۲۹ھ مطابق فروری ۲۰۰۸ء	شمارہ: ۲

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۵ روپئے، سالانہ -/۱۵۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۸۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۲۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۲۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	ہجرت حبشہ مسلم اقلیت کے لیے اسوہ	ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی	۶
۳	ٹی وی پر علماء کرام کا آنا مثبت ومنفی پہلو	مولانا سعید احمد جلال پوری	۱۹
۴	قیام دارالعلوم دیوبند کا دینی وسیاسی پس منظر	پروفیسر بدرالدین الحافظ	۲۹
۵	دارالعلوم دیوبند- میرے چند مشاہدات وتجربات	ڈاکٹر ظہور الحق	۳۵
۶	خواب کی حقیقت اور اس کے احکام	مفتی تنظیم عالم قاسمی	۳۹
۷	قطع حیات بہ جذبۂ رحم (Euthanasia) کی شرعی حیثیت	مفتی محمد شمیم اختر قاسمی	۴۵

ختم خریداری کی اطلاع

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ❁ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ❁ چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- ❁ پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ❁ ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

ہمارے ملک ہندوستان کو بجا طور پر دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اعزاز حاصل ہے، جمہوریت کی مستحکم و پائیدار روایت کے سبب کوئی بھی طاقت مطلق العنان نہیں ہوسکتی، اس کے باوجود کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی جزوی واقعہ یا فرد کے ناروا اور ناپسندیدہ عمل کو سامنے رکھ کر پورے فرقہ کو نشانہ بنادیا جاتا ہے، یہ روش اور وطیرہ کبھی سیاسی حکمت عملی، کبھی سرکاری افسران کی بداعمالیوں اور کبھی دیگر اعلیٰ اداروں کے افراد کی بددیانتی کی بناء پر فروغ پارہا ہے۔ بسا اوقات یہ رویہ اس قدر قوی ہوجاتا ہے کہ تمام سماجی رویوں کو متاثر کرنے لگتا ہے، اس کی بدترین مثال دہشت گردی کے نام پر سرکاری ایجنسیوں کی کارروائیاں ہیں، جن کا نشانہ بطور خاص ملک کی سب سے بڑی اقلیت بنتی رہی ہے۔ ہماری حکومتوں کی اس عادت بد نے کہ وہ ملک کے دستور، اس کے سیکولر نظام، اور قانون وانصاف کی بجائے بیرونی طاقتوں کے چشم وابرو کو دیکھتی ہیں، صورت حال کو مزید سنگین بنادیا ہے کہ دہشت گردی کے عنوان سے پوری قوم مسلم کو مشکوک ومشتبہ بنانے کی شرمناک اور مجرمانہ پالیسی کو بروئے کار لانے کے لئے سرکاری اہل کار سرگرم ہیں، وشوہندو پریشد، بجرنگ دل، شیوسینا جیسی کھلی مسلم دشمن تنظیموں کی پالیسیاں سب کو معلوم ہیں، لیکن سیکولرزم اور جمہوریت پر یقین کا دعویٰ کرنے والے اور اقلیتوں کی بہی خواہی کا دم بھرنے والے جب اس سازش میں ملوث ہوجائیں تو یقیناً ہم کو زیادہ چوکنا ہونا پڑے گا، اور از سرنو اپنے رویہ کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔

ملک میں قائم دینی مدارس صرف علم دین ہی کے محافظ نہیں بلکہ انسانیت، اخلاق، تہذیب و شرافت، حب الوطنی اور وفاداری کے مضبوط قلعے ہیں، یہی ایثار وقربانی کے وہ مراکز ہیں جہاں سے جہاد آزادی کی تحریک کو اصل سرمایہ ملا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سید احمد شہید بریلوی، مولانا محمد اسماعیل شہید، مولانا عبدالحئ بڈھانوی، مولانا محمد جعفر تھانیسری، مولانا سید نصیرالدین دہلوی، مولانا ولایت علی صادق پوری،

مولانا عنایت علی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا احمد اللہ شاہ، مولانا سرفراز علی گورکھپوری، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا عبدالقادر لدھیانوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ تھانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود حسن شیخ الہند، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الاسلام، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد شاہد ناصری، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، وغیرہ مجاہدین آزادی جن کی فہرست بڑی طویل ہے، انھیں دینی مدارس کے ساختہ پرداختہ تھے، جنھوں نے نہ صرف انگریزوں سے مقابلہ کیا بلکہ دوسروں کے اندر بھی اس کا جذبہ پیدا کیا، ملک عزیز کے لئے خود تڑپے اور دوسروں کو بھی تڑپایا، ملک کی عزت وآزادی کی خاطر ہر قربانی دی، اور دوسروں کو قربانی کا حوصلہ بخشا۔

یہ مدرسے صدیوں سے قائم ہیں، حکومتیں آئیں اور چلی گئیں، بساط سیاست بچھی اور لپیٹ دی گئی، لیکن حق وصداقت اور انسانیت وشرافت کے یہ قلعے محفوظ رہے، اور انشاء اللہ آئندہ بھی محفوظ رہیں گے۔

آج ان مدارس کو دہشت گردوں کا اڈہ بتانا، ان پر قدغن لگانے کے لئے ان کی فہرست تیار کرانا، ان سے منسلک طلبہ وعلماء کو بیجا طور پر پریشان کرنا اور بغیر کسی معتبر ثبوت کے انھیں گرفتار کرنا ایک ایسا گھناؤنا اور بدترین جرم ہے جسے کسی طرح برداشت نہیں کیا جائے گا، ان مدرسوں کے طلبہ کی شرافت، انسانیت اور بلند اخلاق کا اعتراف ہر ضلع اور شہر کے حکام کو ہے، ان مدارس کا کوئی طالب علم نہ بسوں کے شیشے توڑتا ہے، نہ ریلوں کی چین پلنگ کرتا ہے، نہ پتھر چلاتا ہے نہ کسی پر بیجا ہاتھ اٹھاتا ہے، نہ اس نے کسی مندر کو توڑا، نہ دھرم شالہ کو، اس نے احتجاج اور مظاہروں کے عام طریقوں کو بھی اختیار نہ کیا پھر بھی اس پر الزام تراشی، اس کو بدنام کرنے اور قومی مجرم بنانے کی سازش حکومت اور اس کے اہل کاروں کا کھوکھلا پن، اور ایک دہشت گردانہ کارروائی ہے۔ کیا حکومت کے ذمہ داروں کو ملک میں لاکھوں نہتے، اور بے گناہ مسلمانوں پر وحشیانہ مظالم کرنے والے مجرم دکھائی نہیں دیتے، کیا انہیں بابری مسجد شہید کرنے والوں کی دہشت گردی اور درندگی نظر نہیں آتی، دہشت گردوں کو تلاش کرنا ہے تو کورٹ سے ان مجرموں کی فہرست طلب کی جائے جنھوں نے گجرات جیسے پرامن شہر میں بربریت اور وحشیت کا ایسا ننگا ناچ کیا جس سے چنگیز اور ہٹلر کی روحیں بھی شرمسار ہوئے بغیر نہیں رہ سکی ہوں گی۔ دہشت گردوں کو تلاش کرنا ہے تو آر ایس، ایس، وشوہندو پریشد اور شیوسینا کے اداروں میں تلاش کیا جائے، اور کیا بعید ہے کہ

دہشت گرد خود انتظامیہ میں چھپے ہوں، اور اپنی دہشت گردی کا سبق پرامن شہریوں کو نہ پڑھایا جائے ورنہ پورا ملک خون کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔

ان مذکورہ بالا حقائق کا تقاضا ہے کہ ہم مندرجہ ذیل امور پر بطور خاص توجہ دیں:

(۱) دینی مدارس ملّی تشخص کے پاسبان ہیں، انھیں مدارس سے آپ کو علماء، فضلاء، داعی، مرشد، مفسر، محدث، فقیہ اور ملّی قائدین ملتے رہے ہیں۔ اگر ان کی عزت پر آنچ آتی ہے اور ان کا وقار مجروح ہوتا ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پوری ملت کی آبرو اور عزت پر حملہ کیا جارہا ہے، جس کو ملت کبھی گوارا نہیں کرے گی۔

(الف) لہٰذا تمام مسلم خواص وعوام اور تمام تنظیموں کے ذمہ دار متحد ومتفق ہوکر جمہوری تقاضوں کے مطابق مدارس کے تحفظ کے لئے سرگرم عمل ہوجائیں۔ اور مرکزی وریاستی حکومتوں سے مطالبہ کریں کہ وہ اعلان کردیں کہ یہ دینی مدارس انسانیت اور تہذیب وشرافت کے محافظ ہیں، ان کا دہشت گردی سے کوئی سروکار نہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ بار بار کی تفتیش کے باوجود بھی انتظامیہ کو ان مدارس میں کوئی مجرم نہ مل سکا۔

(ب) آئندہ ایسی تمام کارروائیوں کا سدباب کیا جائے تو دینی مدارس کے وقار کو مجروح کرتی ہوں، اور آئین ہند سے حاصل دینی، تعلیمی اور تہذیبی ورثہ کی حفاظت وترویج کے حق میں قدغن لگاتی ہوں۔

(۲) ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ہمارے خلاف پورے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلائی جارہی ہے، کھلے اور چھپے فسطائی عناصر ہمارے وجود کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ہمیں اشتعال دلاکر اور ہمارے جذبات بھڑکا کر ہمیں پولیس اور فوج کی گولیوں کا نشانہ بنانے کی مسلسل منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔

(الف) اس صورت حال میں ہمیں ہوشیار رہنا ہے اور اپنے اندر شعور کی پختگی اور بالغ نظری پیدا کرنا ہے، اپنے دین اور سنت رسول ﷺ پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے اپنی دینی قیادت کا ساتھ دینا ہے۔

(ب) ہم اپنے عوام سے خصوصی طور پر کہتے ہیں کہ فرقہ پرست طاقتوں سے ہوشیار رہیں، اور ملک کے پرامن شہریوں سے اپنے تعلقات استوار رکھیں، ان سے کبھی بھی اشتعال کی بات نہ کریں، اور انھیں اطمینان دلائیں کہ ہمارا آپ سے کوئی اختلاف نہیں ہے، ہم اور آپ ایک کشتی کے سوار ہیں، ہمارا اختلاف اور لڑائی صرف ان طاقتوں سے ہے جنھوں نے ملک کی سیکولر قدروں کو پامال کرکے ظلم وجارحیت کو اپنا شیوہ بنالیا ہے۔

ہجرتِ حبشہ مسلم اقلیت کے لیے اسوہ

از: پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی
صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسوۂ رسول ﷺ کی بڑی اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔ یہ اسوہ مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بھی ہے اور معیار ہدایت بھی ہے۔ اسی لیے مسلمان جہاں کہیں اور جن حالات میں ہوتا ہے اپنے مسائل کا حل رسول اللہ ﷺ کے اسوہ میں ڈھونڈتا ہے اور اپنی زندگی کا سفر اسی کی رہنمائی میں طے کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو راستہ سے بھٹک جائے گا، منزل اس سے دور ہو جائے گی، وہ اپنی قومی پہچان اور تہذیبی تشخص کو بھی کھو دے گا اور مقصد حیات سے بھی محروم ہو جائے گا۔

اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ایسے ملکوں میں آباد اور مقیم ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت اور اکثریت نہیں ہے۔ اکثریت دوسری قوموں کی ہے اور حکومت بھی انہی کی ہے۔ ان میں بعض ممالک تو وہ ہیں جہاں کسی عہد میں مسلمانوں کی حکومت تھی مگر انقلاب زمانہ نے ان کی حکومت کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ وہاں کے دوسرے باشندوں نے لے لی۔ مثلاً بھارت، یوگنڈا، ہسپانیہ، گرجستان وغیرہ۔ اور بعض ممالک وہ ہیں جہاں مسلمان تلاش معاش اور ملازمت وتجارت کی خاطر گئے، وہاں جا کر آباد ہو گئے اور وہاں کی شہریت اختیار کر لی، یا وہاں کے مقامی باشندوں نے قبول اسلام کیا۔ جیسے برطانیہ، امریکہ، اسٹریلیا، جاپان وغیرہ اور بعض ممالک وہ بھی ہیں جہاں مسلمان ابتدار ہی سے قبول اسلام کے بعد مقیم ہیں اور اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں، مثلاً نیپال اور چین وغیرہ۔ ان ممالک میں مسلمانوں کو مختلف قسم کے سماجی، معاشی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی مسائل ومشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے مسائل ملکوں، حکومتوں اور معاشروں کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں اور بہت سے مسائل مزاج اور نوعیت کے اعتبار سے یکساں ہوتے ہیں۔ مسلمان اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے جہاں ملکی قانون اور معاشرتی طور وطریق کا سہارا

لیتا ہے وہاں وہ اپنے مذہبی حوالہ اور تہذیبی ورثہ کی طرف بھی دیکھتا ہے۔ یعنی وہ مقصد زندگی اور ضرورت زندگی دونوں میں توازن اور ہم آہنگی قائم کرکے اپنے وجود کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔

ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کے علاوہ دوسری قومیں رہتی اور بستی ہیں اور ایک مذہب کے بجائے کئی مذاہب اور ایک قومیت کے بجائے کئی قومیتوں کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں، اسوۂ رسول سے استفادہ اور راہ نمائی حاصل کرنے کی اگر سعی کی جاتی ہے تو ہمارا ایک مذہبی طبقہ رسول کریم ﷺ کی مکی زندگی کو اسوۂ کاملہ قرار دیتا ہے، کیونکہ کفار ومشرکین کے درمیان رہ کر جن مشکلات ومصائب کا آپ نے مقابلہ کیا اور جس طرح صبر واستقامت اور حکمت کے ساتھ دین کی دعوت دی اس سے بڑھ کر کوئی اور قابل تقلید نمونہ نہیں ہوسکتا۔

دوسرا مذہبی طبقہ مدنی زندگی کو اسوۂ کاملہ کے طور پر دیکھتا ہے، کیونکہ احکام کی تکمیل، سماجی اور سیاسی اصولوں کی تطبیق اور تکمیل اسلام کا مرحلہ یہی ہے اور ہمیشہ کے لیے رہنما ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مکی اور مدنی دونوں زندگیاں احتیاج واختیار کے لحاظ سے اپنی اپنی اہمیت رکھتی ہیں اور اجتماعی معاملات میں ہمارے لیے دلیل راہ کا کام دیتی ہیں، مگر رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی کا اتباع اور انطباق مومن کا نصب العین ہے۔ اس لیے اس کے ہر پہلو کو نظر میں رکھنا ضروری ہے اور ہر مرحلہ دعوت سے رہنمائی حاصل کرنا ناگزیر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوتی زندگی میں ایک اہم مرحلہ جو عموماً نظر انداز ہوجاتا ہے حالانکہ کثیر قومی معاشرہ میں براہ راست ہماری رہنمائی کرسکتا ہے وہ ہجرت حبشہ کا ہے۔ ہجرت حبشہ ۶۱۵ء یعنی نبوت کے پانچویں سال ہوئی تھی اور حبشہ سے مسلمانوں کی واپسی مختلف وقتوں میں ہوئی آخری وفد میں حضرت جعفر طیار مدینہ منورہ ۷ھ میں تشریف لائے۔ اس طرح حبشہ میں مسلمانوں کے قیام کی مدت اوسطاً پندرہ سال ہوتی ہے۔

محدثین اور سیرت نگاروں نے ہجرت حبشہ کا بیان اختصار سے کیا ہے۔ مہاجر صحابہ کرام کی حبشہ کی زندگی کی تفصیلات اور مقامی باشندوں کے ساتھ ان کے تعلقات اور لین دین کی جزئیات کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود جو کچھ معتبر روایات اور تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے وہ بجائے خود اتنا روشن اور حوصلہ بخش ہے کہ آج ہم ان کی روشنی میں تکثیری معاشرہ میں مسلمانوں کے اجتماعی حالات کو دیکھ سکتے ہیں اور لائحہ عمل طے کرسکتے ہیں۔

ہجرت کی اسلام میں جو اہمیت ہے اس کے متعلق اتنا جان لینا کافی ہے کہ رسول پاک ﷺ نے اسے تمام گناہوں کا خاتمہ کرنے والا بتایا ہے۔ الاسلام یھدم ما کان قبلہ والھجرۃ

تھدم ما کان قبلھا. (۱) اسلام ماقبل کے سارے گناہ ختم کردیتا ہے اور ہجرت ماقبل کے سارے گناہ مٹادیتی ہے۔

ہجرت حبشہ اسلام میں پہلی ہجرت تھی۔ یہ ہجرت جن حالات میں ہوئی وہ اسلام اور پیغمبر اسلام اور جاںنثارانِ اسلام کے لیے نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن تھے، قریش کی مخالفت کا طوفان تضحیک، طنز اور دشنام طرازی کی حدوں سے گذر کر جسمانی اذیتوں، ناقابل برداشت زیادتیوں اور قتل وغارت گری میں داخل ہو چکا تھا، ایمان آزمائش میں اور جان خطرہ میں تھی۔ ابن اسحاق کے بیان میں اس کی ہلکی سی جھلک ملتی ہے۔

''کفار نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں پر دشمنی کی انتہا کردی، ہر قبیلہ اپنے اندر کے مسلمانوں پر حملہ آور تھا، وہ ان کو قید کرتا، ان کو مارتا پیٹتا اور ٹارچر کرتا، ان کو بھوکا پیاسا رکھتا اور جب دھوپ تیز ہوجاتی تو مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر لٹادیتا، جو کم زور مسلمان ہوتے ان کو اذیت دے کر دین سے باز رکھتا، چنانچہ بعض مسلمان ناقابل برداشت ظلم سے مجبور ہوکر دین سے پھر جاتے اور بعض ہمت اور حوصلہ سے کام لیتے اور اللہ ان کی حفاظت کرتا۔'' (۲)

نبی ﷺ کیلئے ان حالات میں ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو مکہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے کا حکم دیں۔ مگر سوال یہ تھا کہ آخر کہاں جائیں، کونسا ملک ان کو اپنے یہاں پناہ دیگا؟ جس طرح قریش اختلاف مذہب کی بنا پر قتل وغارت گری پر آمادہ تھے اسی طرح ہر ملک کے لوگ اپنے مذہب کا مخالف سمجھ کر یہی سلوک کریں گے۔ سرزمین حجاز سے ملی ہوئی سرحد ملک یمن کی تھی، آپ ﷺ اہل یمن کی حکمت کے قائل تھے اور یمن میں آپ کے بعض صحابہ بھی موجود تھے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ یمن ہی کے رہنے والے تھے، رسول پاک کے پاس حاضر ہوئے، ایمان لائے اور ایمان وعمل کی اصولی تعلیمات حاصل کرکے یمن واپس چلے گئے۔ (۳) مگر آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو یمن ہجرت کرنے کا حکم نہیں دیا، کیونکہ وہاں کا حکمراں ظالم تھا، جس سال آپ ﷺ کی پیدائش ہوئی اسی سال وہاں کے گورنر ابرہہ نے ہاتھیوں کا لشکر لے کر خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کیلئے مکہ پر حملہ کردیا تھا۔ حضور کے دادا عبدالمطلب نے اس موقع پر رب کعبہ سے جو التجا کی تھی اس کا یہ مشہور شعر ہے۔

لاھَمّ ان العبد یمنع رحلہ فامنع حالالك

لا یغْلبو فی صلیبھم ومحالھم ابدا محالك (۴)

اے اللہ! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کی حفاظت فرما، کبھی ان کی صلیب اور ان کی تدبیریں تیری تدبیروں پر غالب نہ آئیں۔

دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اہل یمن سے اہل مکہ کی سناشائی تھی، مسلمان وہاں ہجرت کر کے جاتے تو اہل مکہ بآسانی اہل یمن کو ان کو واپس کرنے پر آمادہ کر لیتے، ہجرت کا عمل بے معنی ہو کر رہ جاتا اور کفار کا تشدد اور بڑھ جاتا۔

رسول پاک ﷺ کی نگاہ انتخاب جزیرہ نمائے عرب سے باہر دوسرے براعظم افریقہ کے ملک حبشہ پر اٹھی۔ اگرچہ اس ملک کا بھی سرکاری مذہب عیسائیت تھی، مگر وہاں کا حکمراں انصاف پسند تھا۔ عرب اور حبشہ کے درمیان سمندر حائل تھا، وہاں سے مہاجرین کو واپس لانا قدرے آسان نہ تھا۔ چنانچہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

"لو خرجتم الی الارض الحبشة فان فیها ملکا لا یظلم عنده احد وهی ارض صدق حتی یجعل اللّٰه لکم خرجا مما انتم فیه"(۵)

(تم لوگ سرزمین حبشہ کو نکل جاؤ، وہاں کا بادشاہ ایسا انصاف پسند ہے کہ اس کے یہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا، وہ سچائی کی سرزمین ہے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ تم کو ان مصیبتوں سے نجات دے جن میں آج تم گھرے ہوئے ہو)

اس ہجرت میں خود رسول کریم ﷺ شامل نہ تھے، بلکہ آپ مکہ میں مقیم رہے، کفار کے ظلم وستم برداشت کرتے رہے اور دین کی دعوت پر لگے رہے۔ شاید اس میں یہ مصلحت شامل رہی ہو کہ ساتھیوں کو حبشہ بھیج کر اور خود مکہ میں رہ کر اسلام کے پیغام کو آفاقی سطح پر پیش کر سکیں گے۔ اس طرح اسلام کے لیے دو مراکز عرب اور افریقہ میں بن جائیں گے۔

حضور ﷺ حبشہ کی حکومت اور معاشرت سے متعارف تھے۔ آپ کے گھر میں دایہ حضرت ام ایمن کا تعلق حبشہ سے تھا اور حضرت بلال حبشی کے والدین بھی حبشہ ہی کے تھے۔

بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے رسول اللہ ﷺ کے خاندانی مراسم بھی تھے، اسی لیے نجاشی کی شخصیت پر اعتماد کر کے اپنے صحابہ کو ان کے ملک بھیج رہے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت جعفر طیارؓ کو ہجرت کے وقت رسول پاک نے ایک خط بھی دیا تھا کہ اسے نجاشی کو دے دینا۔ حدیث وسیرت کے موجودہ ریکارڈ کی بنا پر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور کی زندگی کا یہ پہلا خط تھا، اس سے پہلے غالباً آپ نے کوئی خط کسی کو نہیں لکھا، اس خط میں تحریر تھا کہ:

''میں اپنے چچازاد بھائی جعفر کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں اس کے ساتھ کچھ اور مسلمان ہیں، جب یہ آپ کے پاس پہنچیں تو ان کی مہمان نوازی کریں۔''(۶)

دوسرا منظوم خط حضرت ابوطالب نے نجاشی کو اس وقت لکھا تھا جب مکہ کے سردار مہاجرین کو

واپس لانے کے لیے دونفری وفد حبشہ روانہ کررہے تھے، اس خط میں لکھا تھا:

الا لیت شعری کیف فی النای جعفر
وعمرو واعداء العدو اقارب
فهل نال افعال النجاشی جعفرا
واصحابه او عاق ذالك شاغب
تعلّم ابیت اللعن انك ماجدٌ
کریم فلا یشقی لدیك المجانب
تعلم بان اللّٰه زادك المجانب
واسباب خیر کلها بك لازب
وانك فیض ذو سجال غزیرة
ینال الاعادی نفعها والاقارب (۷)

کاش مجھے معلوم ہوتا کہ دور دراز علاقہ میں جعفر اور ان کے شدید ترین ہم وطن دشمن عمرو بن العاص کے درمیان کیا معرکہ ہوا، کیا جعفر اور ان کے ساتھیوں سے نجاشی نے حسن سلوک کیا، یا رکاوٹوں نے اس کا فیض روک دیا؟ اے نجاشی لعنت آپ سے دور ہے، آپ شریف اور معزز ہیں، آپکے دربار میں کوئی اجنبی محروم نہیں رہ سکتا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت و دولت اور ہر قسم کے اسباب خیر عطا کیے ہیں۔ آپ سخاوت کا گہرا سمندر ہیں جس سے دوست اور دشمن سبھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہجرت حبشہ کا سب سے مفصل بیان ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے جس کو امام احمد بن حنبل نے مسند میں ابن ہشام نے سیرۃ النبی میں اور ابونعیم اصفہانی نے دلائل النبوۃ میں مکمل نقل کیا ہے۔ ماحصل اس روایت کا یہ ہے کہ دربار رسالت سے ہجرت کا حکم ملا تو حضور ﷺ کے جانثار ساتھی حبشہ کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں گیارہ مرد اور پانچ عورتیں شامل تھیں، ان کے نام اس طرح ہیں:

(۱) عثمان بن عفانؓ
(۲) ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنت محمدؐ
(۳) عبدالرحمٰن بن عوف
(۴) زبیر بن عوام
(۵) ابوحذیفہ بن عتبہؓ
(۶) ان کی بیوی سہلہ بنت سہل
(۷) مصعب بن عمیر
(۸) ابوسلمہ بن عبدالاسد
(۹) ان کی بیوی ام سلمہ
(۱۰) عثمان بن مظعون

(۱۱) عامر بن ربیعہ (۱۲) ان کی بیوی لیلیٰ بنت ابی حثمہ
(۱۳) سہیل بن بیضاء (۱۴) ابوسیرہ بن ابی رہب عامری
(۱۵) ان کی بیوی ام کلثوم بنت سہل بن عمر (۱۶) حاطب بن عمر۔(۸)

یہ ہجرت نبوت کے پانچویں سال ماہ رجب میں ہوئی تھی۔سولہ افراد پر مشتمل مہاجرین کا یہ قافلہ جب شعیبہ کی بندرگاہ پر پہنچا تو ان کو حبشہ جانے والی دو کشتیاں مل گئیں اور وہ فوراً روانہ ہوگئے۔اہل مکہ کو جب یہ اطلاع ملی تو انھوں نے ان کے پیچھے آدمی دوڑائے مگر اس وقت تک کشتیاں ساحل سے دور جاچکی تھیں،لہٰذا وہ ناکام واپس لوٹے۔(۹)

حبشہ میں نجاشی نے مہاجروں کا خیر مقدم کیا اور ان کو پناہ دی۔شعبان اور رمضان کے دو ماہ حبشہ میں گذرے تھے کہ مسلمانوں کو یہ اطلاع ملی کہ مکہ کے کفار مسلمان ہوگئے ہیں اور ظلم وستم بند ہوگیا ہے،اس لیے یہ حضرات مکہ لوٹ آئے۔مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ اطلاع غلط تھی۔چنانچہ بااثر مہاجرین اپنے کفار دوستوں کی پناہ لے کر مکہ میں مقیم رہے۔(۱۰) کفار مکہ نے نئے سرے سے مسلمانوں پر مظالم ڈھانا شروع کیا اور اب زیادہ زور وشور سے اذیت پہنچائی۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ مسلمانوں کو مکہ سے حبشہ ہجرت کرنے کی تلقین فرمائی،اس ہجرت میں ۸۳ مرد اور ۱۸ خواتین یعنی کل ۱۰۱ صحابہ وصحابیات شریک رہے۔(۱۱)

اہل مکہ نے جب یہ سنا کہ نجاشی نے مہاجروں کو اپنے یہاں پناہ دی،ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو وہ اسے برداشت نہ کرسکے اور طے کیا کہ ہر حال میں مہاجروں کو حبشہ سے نکلوانا ہے اور مکہ واپس لانا ہے۔

حبشہ سے اہل مکہ کا تجارتی رابطہ تھا،چنانچہ دو تجربہ کار نمائندوں عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص کو نجاشی اور ان کے وزراء کے لیے تحفہ تحائف دے کر حبشہ روانہ کردیا۔ان تحائف میں بیش تر چمڑے کی مصنوعات تھیں۔کفار کے نمائندوں نے حبشہ پہنچ کر نجاشی کے تمام وزیروں کو تحفے پیش کیے اور ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ بادشاہ کو مہاجرین کو واپس کرنے پر آمادہ کریں گے۔قریشی نمائندے آخر میں نجاشی کی خدمت میں تحفے لے کر حاضر ہوئے اور عرض مدعا رکھا:

''چند بے وقوف نوجوان اپنے قومی دین کو چھوڑ کر آپ کے ملک میں آگئے ہیں مگر آپ کے دین میں داخل نہیں ہوئے؛ بلکہ ایک ایسے دین کا اتباع کرتے ہیں جس سے نہ ہم واقف ہیں اور نہ آپ۔ان کی قوم کے بزرگوں نے ہمیں آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ آپ ان کو لوٹا دیں،کیونکہ وہی لوگ ان کے سرپرست ہیں،وہی

جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے اور کیوں ان سے ناراض ہیں۔'' (۱۲)

نجاشی سے وفد نے گذارش کی کہ ان مہاجروں کو اپنی بات کہنے کا موقع دیے بغیر ان کے حوالے کیا جائے۔ وزیروں نے بھی وفد کی تائید کی اور بغیر مہاجروں کی بات سنے ان کو وفد کے حوالہ کرنے کی درخواست کی مگر بادشاہ انصاف پسند تھا فطری انصاف کے تقاضوں سے واقف تھا اس نے ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ میں اس طرح ان کو تمہارے حوالہ نہیں کرسکتا، جو لوگ میرے ملک میں آئے، میرے پڑوس میں رہے، میری پناہ کو دوسروں کے مقابلہ میں ترجیح دی، میں ان کو ضرور بلاؤں گا اور ان سے تمہارے عائد کردہ الزامات کے سلسلہ میں ضرور پوچھ گچھ کروں گا اگر وہ تمہارے الزامات کی تصدیق کریں گے تو میں ان کو تمہارے حوالہ کردوں گا اور واپس بھیج دوں گا اور اگر وہ دوسری بات کہتے ہیں تو میں ان کو ہرگز حوالہ نہیں کروں گا، بلکہ بدستور حسن سلوک کروں گا۔ (۱۳)

مسلمانوں کی پریشانی یہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے اس قدر دوری پر تھے کہ براہِ راست ان سے رہنمائی حاصل کرنا ممکن نہ تھا، ہر مشکل کو خود ہی باہمی مشورہ سے حل کرنا تھا، ان کے پاس حضور کی اصولی رہنمائی تھی قریش کے نمائندے کے الزام اور مطالبہ کا جواب دینے کے لیے جب نجاشی نے صحابہ کرام کو بلوایا تو حضرات صحابہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس وقت کیا حکمت عملی اختیار کی جائے جس سے وہ کفار کے شکنجہ میں پھنسنے سے محفوظ رہ سکیں، اسلام کی تاریخ میں اجنبی ملک میں مسلمانوں کا یہ پہلا مقدمہ تھا اور اس پر اسلام کے مستقبل کا انحصار تھا۔ حضرت جعفر صحابہ کرام کے سربراہ تھے اور حضرت ابوہریرہؓ کے بقول نبی ﷺ کے بعد سب سے افضل انسان تھے (۱۴) صحابہ کرام نے اس وقت جو موقف اپنایا وہ دو نکتوں پر مشتمل تھا، پہلا نکتہ یہ تھا کہ ہم اپنے نبی کی تعلیم کے خلاف کوئی بات نہیں کہیں گے چاہے جو کچھ بھی ہوجائے۔ (۱۵)

دوسرا نکتہ یہ تھا کہ وہ بادشاہ کے نظام انصاف کا سہارا لیں گے۔

صحابہ کرام کو حضور ﷺ سے معلوم ہو چکا تھا کہ بادشاہ انصاف پرور ہے اور خود ان حضرات نے بادشاہ کے پڑوس میں رہ کر اس کی انصاف پسندی کا عملاً مشاہدہ اور تجربہ کرلیا تھا لہٰذا ان کو اعتماد تھا کہ حق وانصاف کی جنگ میں وہ فتح یاب ہوں گے لہٰذا انھوں نے اسی انصاف کے نظام میں اپنے دفاع کی راہ نکالی۔

نجاشی نے وزراء، علماء، مشاہدین، مدعی اور مدعا علیہ سے بھرے دربار میں جب ان کے سامنے قریش کے وفد کا مقدمہ رکھا تو مہاجرین کے قائد حضرت جعفر طیار نے نجاشی کے ذریعہ اپنے دفاع میں تین سوالات قریش کے نمائندوں سے کیے۔

(۱) کیا ہم کسی کے غلام ہیں؟ جو اپنے آقا سے بھاگ کر آئے ہیں، اگر ایسا ہے تو ہمیں ضرور واپس کیا جائے۔

نجاشی نے عمرو بن العاص سے جواب طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ نہیں یہ لوگ آزاد اور شریف ہیں۔

(۲) کیا ہم کسی کو قتل کر کے بھاگے ہیں؟ اگر ہم نے ناحق خون کیا ہے تو ہمیں مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا جائے۔

نجاشی نے وفد سے جواب طلب کیا تو عمرو بن العاص نے کہا کہ نہیں ایک قطرہ خوں بھی نہیں بہایا۔

(۳) کیا ہم کسی کا مال لے کر بھاگے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم اس کو ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

نجاشی نے وفد سے جواب مانگا تو انھوں نے کہا نہیں ایک پیسہ بھی لے کر نہیں بھاگے۔(۱۶)

حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کی عدالت میں قریش کے الزامات کے جواب میں جو سوالات اٹھائے تھے وہ اتنے معقول، برمحل اور عام ذہن کو اپیل کرنے والے تھے کہ عدالت میں موجود ہر شخص نے مہاجرین کی بے گناہی اور کفار قریش کی ایذا رسانی کا اندازہ لگا لیا، پھر بھی نجاشی نے مقدمہ خارج نہیں کیا بلکہ قریش کے وفد کے لگائے الزامات پر بحث شروع کی، انھوں نے حضرات صحابہ سے اس سوال کا جواب طلب کیا کہ وہ کونسا دین ہے جس کے باعث تم نے اپنی قوم کو چھوڑا، نہ ہمارے مذہب میں داخل ہوئے اور نہ دنیا میں موجود دوسرے مذاہب میں شامل ہوئے؟۔

اس سوال کے جواب میں حضرت جعفر نے اپنے دینی موقف اور مذہبی تعلیم کی وضاحت نہایت معقولیت اور بصیرت کے ساتھ کی، انھوں نے کہا۔

''بادشاہ سلامت! ہم جاہلیت میں مبتلا تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاری کا ارتکاب کرتے تھے، رشتہ داروں سے قطع تعلق کرتے تھے، پڑوسیوں سے برا سلوک کرتے تھے، ہمارا طاقت ور کمزور کو دبا لیتا تھا، ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ نے ہمارے درمیان ایسا رسول بھیجا جس کے نسب، سچائی، امانت اور پاکدامنی سے ہم واقف ہیں۔

انھوں نے ہمیں دعوت دی کہ ہم صرف ایک معبود کی پرستش کریں، اس کے علاوہ پتھر وغیرہ کے وہ تمام بت جن کی ہم اور ہمارے آباء واجداد پرستش کرتے تھے چھوڑ دیں، انھوں نے ہمیں سچ بات بولنے کی، امانت داری کی، صلہ رحمی کی، پڑوسیوں سے حسن سلوک کی، حرام کاموں اور دوسروں کا خون بہانے سے پرہیز کرنے کی تعلیم دی۔

انھوں نے ہمیں بدکاری سے، جھوٹی بات کہنے سے، یتیم کا مال کھانے سے، پاک دامن عورتوں پر الزام لگانے سے روکا۔ انھوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں، نماز، زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ کا حکم دیا۔ چنانچہ ہم نے ان کی تصدیق کی، ان پر ایمان لے آئے، اور اللہ کی طرف سے لائے ہوئے احکام میں ان کی پیروی کی، ایک اللہ کی عبادت کی، شرک چھوڑ دیا، جس کو حرام کہا اسے حرام جانا، جسے حلال کہا اسے حلال سمجھا۔

بادشاہ سلامت! یہی وہ جرم تھا جس کی بنا پر ہماری قوم نے ہم سے دشمنی کی ہمیں ٹارچر کیا، ہمارے دین کی خاطر آزمائش میں ڈالا تاکہ اللہ کی عبادت چھوڑ کر ہم پھر بتوں کی پوجا کرنے لگیں، اور جاہلیت کی طرح گندے کاموں کو جائز سمجھیں۔ جب انھوں نے ہم پر قہر ڈھایا، ہم پر ظلم کیا، ہمارا جینا دوبھر کردیا اور ہمارے مذہب کے درمیان رکاوٹ ڈالی تو ہم وطن سے نکل کر آپ کے ملک میں چلے آئے، دوسروں کے مقابلہ میں آپ کو ترجیح دی، آپ کی ہمسائیگی اختیار کی اس امید پر کہ آپ کے یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ (۱۷)

نجاشی اور ان کی عدالت عالیہ جب مطمئن ہوگئی کہ قریش کا الزام غلط اور مسلمانوں کا بیان درست ہے، تو نجاشی نے آخری سوال مہاجرین صحابہ سے یہ کیا کہ جس خدائی حکم اور تعلیم کا تم حوالہ دے رہے ہو اس کے متن کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے؟۔

تب حضرت جعفر طیارؓ نے کہا جی ہاں موجود ہے اور موقع کی مناسبت سے سورہ مریم کے ابتدائی رکوع کی تلاوت شروع کی۔ تلاوت کیا کی ع از دل خیزد بر دل ریزد، کا سماں باندھ دیا، حضرت جعفر سورہ مریم کی تلاوت کی تو باران خشت برسنے لگی، نجاشی نے روتے روتے داڑھی تر کرلی، پادریوں نے روتے روتے اپنے صحیفے بھگو لیے، حضرت جعفر کے تین نکاتی سوالات نے عدالت کو پہلے ہی مطمئن کردیا تھا اور اب ان کی تلاوت قرآن نے عدالت عالیہ کے دلوں کو فتح کرلیا۔ نجاشی انصاف پرور ہی نہیں، صاحب دل اور صاحب معرفت بھی تھے، انھوں نے عدالت میں فیصلہ سنادیا۔

"ان ھذا والذی جاء به عیسیٰؑ لیخرجن من مشکاة واحدة، انطلقا فلا واللّٰه لا اسلمهم الیکما" (۱۸)

(بے شک یہ تعلیم اور جس تعلیم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے وہ ایک ہی سرچشمہ نور کی ضیاپاشیاں ہیں۔ قریش کے نمائندو تم واپس جاؤ میں ہرگز ان مہاجرین کو تمہارے حوالہ نہیں کرسکتا۔)

قریش کے نمائندے مقدمہ ہار گئے، مگر نچلے نہ بیٹھے، انھوں نے طے کیا کہ اگلے دن وہ نئے

الزامات لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور مہاجر مسلمانوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دیں گے۔ عبداللہ بن ربیعہ نے عمرو بن العاص کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرنا اگرچہ وہ ہمارے دھرم کے مخالف ہیں مگر ہیں تو ہمارے ہی بھائی بندے، مگر عمر بن العاص نے نہیں مانا اور کہا میں ضرور بادشاہ کو بتاؤں گا کہ یہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کو عبد یعنی بندہ سمجھتے ہیں۔ (۱۹)

اگلے دن پھر دربار لگا، قریش کے وفد نے نئی چارج شیٹ داخل کی اور بادشاہ سے درخواست کی کہ مسلمانوں سے جواب طلب کریں۔ مہاجرین عدالت میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تم حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ قریش کے نمائندوں نے یہ سوچ کر چال چلی تھی کہ گذشتہ دن ان کے مشرکانہ مذہب کی خلاف مسلمانوں نے جو بیان دیا تھا اس معاملہ میں بادشاہ اور مسلمانوں کا موقف ایک تھا اس لیے بادشاہ کا فیصلہ ان کے حق میں ہوگیا۔ آج جب کہ بادشاہ کے عقیدہ کے خلاف مہاجروں کو بیان دینا ہوگا تو یقیناً بادشاہ بھڑک جائے گا اور فیصلہ ہمارے حق میں ہوجائے گا۔

مسلمانوں نے باہمی مشورہ سے طے کیا تھا کہ جس عقیدہ کی خاطر انھوں نے وطن چھوڑا ہے اسے بادشاہ کی پسند وناپسند پر نہیں چھوڑیں گے بلکہ حق بات کہیں گے، چنانچہ بھری عدالت میں حضرت جعفر طیار نے بیان دیا۔

''ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے کہا ہے کہ وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا کلمہ تھے جسے کنواری مریم پر اللہ نے القا کیا تھا'' (۲۰)

نجاشی نے یہ سن کر زمین سے ایک لکڑی اٹھائی اور کہا جو تم نے کہا ہے حضرت عیسیٰ اس سے اس لکڑی کے برابر بھی مختلف نہ تھے، تم لوگ جاؤ اور میرے ملک میں امن وسکون کی زندگی گزارو، جو تم پر زیادتی کرے گا اس سے مواخذہ ہوگا۔'' (۲۱)

بعض سیرت نگار یہ بھی لکھتے ہیں کہ نجاشی نے نہ صرف مہاجر مسلمانوں کے عقیدہ کی تائید کی تھی بلکہ رسول کریم کی رسالت کی شہادت دے کر حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تھے۔ (۲۲) ابن سعد کا بیان ہے کہ نجاشی سن ۷ ہجری میں اس وقت اسلام لائے جب رسول پاک ﷺ نے ان کو خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی۔ (۲۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ نجاشی نے فرمایا اگر میرے اوپر ملک کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو میں رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی جوتیاں اٹھاتا۔ (۲۴)

اجنبی ملک میں یہ پہلا مقدمہ تھا جو مسلمانوں نے جیتا تھا۔ اس کے بعد مسلمان تقریباً ۱۵

سال تک حبشہ میں مقیم رہے۔ وہاں انھوں نے شادی بیاہ کی، ان کی اولادیں ہوئیں اور ایک پرامن شہری کی زندگی گذارتے رہے۔ قرائن سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان نجاشی کے قریب آباد تھے، سوآدمیوں پر مشتمل ایک کالونی آباد ہوگئی تھی اور حبشہ کی یہ پہلی مسلم کالونی تھی مگر ان کا ذریعہ معاش کیا تھا، سماجی معاملات کیسے تھے، کتب سیرت میں اس کی جزئیات نہیں ملتیں البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی نے مہاجرین کی لباس اور طعام کی شکل میں امداد کی۔ (۲۵) مسلمان وہاں چھوٹا موٹا کاروبار بھی کرتے تھے اور محنت ومشقت سے روزی کماتے تھے۔ مہاجرین جب تک حبشہ میں رہے ملک کے خیرخواہ اور نجاشی کے لیے دعا کرتے رہے چنانچہ جب نجاشی کے خلاف اس کے ایک شہری نے بغاوت کی تو مسلمانوں نے نجاشی کی کامیابی کے لیے خشوع وخضوع کے ساتھ دعائیں کیں۔

حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں:

"فدعونا اللّٰہ تعالیٰ للنجاشی بالظھور علی عدوہ والتمکین لہ فی بلادہ" (۲۶)

ہم لوگوں نے نجاشی کے لیے دعا کی اللہ اسے دشمن پر فتح عطا کرے اور اس کے ملک پر اس کا اقتدار جمادے۔

حضرت جعفر نے اسلام کے تعارف پر مشتمل جو تقریر نجاشی کے دربار میں کی تھی اس میں رسول پاک کی چودہ تعلیمات کا ذکر تھا:

(۱) توحید (۲) سچائی (۳) امانت داری (۴) صلہ رحمی (۵) پڑوسیوں سے اچھا سلوک (۶) حرام کاموں سے پرہیز (۷) خونریزی سے گریز (۸) بدکاری سے پرہیز (۹) جھوٹی بات سے پرہیز (۱۰) مال یتیم سے پرہیز (۱۱) عورتوں پر الزام تراشی سے گریز (۱۲) نماز قائم کرنا (۱۳) زکوٰۃ دینا (۱۴) روزہ رکھنا۔

ان تعلیمات میں، مذہب، اخلاق اور سماج سب کچھ کی رہنمائی موجود ہے۔ یہی وہ بنیادی تعلیم ہے جو اسلامی معاشرہ کی اساس ہے۔

مہاجرین صحابہ کی اجتماعیت کو ایک دھکا اس وقت لگا جب کہ ان میں سے ایک مہاجر عبیداللہ بن جحش نے اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرلی۔ خواہ اس کی وجہ معاشی حالت رہی ہو یا تربیت کی کمی رہی ہو یا نجاشی کے حسن سلوک سے متاثر ہوکر اس نے یہ اقدام کیا ہو، بہرحال اس کے ارتداد سے مسلمانوں کو ذہنی اذیت پہنچی اور ان کی اجتماعیت کو دھکا لگا۔ مگر مسلمانوں نے اس صدمہ کو برداشت کیا، عبیداللہ بن جحش کا اسی حال میں انتقال ہوگیا۔ اس کی بیوی ام حبیبہؓ جو سردار مکہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں، اب بیوہ ہوچکی تھیں، رسول کریم نے نجاشی کو خط لکھا کہ وہ ان سے نکاح

کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لہٰذا غائبانہ عقد کر کے ان کے پاس مکہ بھیج دیں۔ چنانچہ سن ۷ ہجری میں نجاشی نے عقد کے ساتھ اپنی طرف سے مہر کی رقم ادا کر کے حضرت ام حبیبہ کو رسول پاک کے پاس بھیج دیا۔ رسول پاک نے اس طرح ان کو شوہر کے ارتداد کی وجہ سے سماجی رسوائی کا صدمہ سہنے سے بچالیا اور اپنی زوجیت میں رکھ کر ان کا رتبہ بھی بڑھا دیا۔ (۲۷)

کتب سیرت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مہاجر مسلمانوں نے حبشہ کے مقامی باشندوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کر دی تھی، چنانچہ ان کی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجہ میں چالیس پچاس حبشیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ (۲۸)

مہاجرین حبشہ کے مقدمہ، بیانات اور اجمالی حالات سے مختصراً یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں:

(۱) مسلمان جہاں کہیں ہوں وہ حق پر قائم رہیں اور حق بات ہی کہیں حالات جیسے بھی ہوں، یہی ان کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کی اساس ہے۔

(۲) دین کی دعوت، حکمت، معقولیت اور مدلل طریقہ سے اپنے ہم وطنوں کو دین اور ہمیشہ طاقت کا مقابلہ حکمت سے کرنے کی سعی کریں۔ اقلیت کے لیے یہ ہتھیار زیادہ کارگر ہے۔

(۳) جس ملک میں رہیں اس کے خیر خواہ اور محبّ وطن بن کر رہیں، چنانچہ نجاشی کے لیے دعاؤں کا اہتمام کر کے صحابہ نے اسی خیر خواہی کا ثبوت دیا تھا۔

(۴) ملک کے نظام عدل سے واقفیت حاصل کریں اور اسے اپنے تحفظ کے لیے اور اپنا حق حاصل کرنے کیلئے استعمال کریں، حضرت جعفر نے نجاشی کی عدالت میں یہی کارنامہ انجام دیا تھا۔

(۵) جس ملک میں رہیں وہاں امن پسند شہری کی حیثیت سے رہیں اور تخریبی کارروائیوں ملوث نہ ہوں۔ حضرت جعفر کی تقریر کا یہ جملہ کہ ''رسول اللہ نے ہمیں پڑوسیوں سے حسن سلوک کی، حرام کاموں سے بچنے اور خونریزی سے گریز کرنے کی تعلیم دی'' یہی سبق اور نصیحت دیتا ہے۔

(۶) مسلمان جہاں بھی ہوں باہمی اتحاد و اتفاق، مشاورت اور یک جہتی سے کام لیں، اپنا کوئی امیر بھی منتخب کریں، چنانچہ حضرت جعفر طیار کی امارت میں مہاجر صحابہ کا باہمی مشورہ سے ایک موقف طے کرنا ہمیں یہی اسوہ فراہم کرتا ہے۔

(۷) اپنے موقف، مقصد حیات اور طرز زندگی سے ہم وطنوں کو واقف کرائیں تاکہ وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ ان کے لیے تحفظ کے مسائل پیدا نہ کریں اور اسلام کو حریف کے طور پر نہ سمجھیں۔ حضرت جعفر کی پوری تقریر کا لب لباب یہی ہے۔

(۸) ہم وطنوں کے مذہب، مزاج اور تہذیبی شعار سے ضروری واقفیت حاصل کریں تاکہ بقائے

باہم کی راہ ہموار ہو۔ ہجرت حبشہ سے قبل سورہ مریم کا نزول اور نجاشی کی عدالت میں حضرت جعفر کی تلاوت سے اس کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔

(۹) مسلمانوں کو اگر کوئی مذہبی یا سماجی صدمہ سے دوچار ہونا پڑے تو وہ صبر واستقلال اور دوراندیشی سے کام لیں، عجلت اور جذباتیت سے ممکن حدتک گریز کریں، جیسا کہ عبیداللہ بن جحش کے ارتداد پر مسلمانوں کے محتاط ردعمل سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱۰) مسلمان جس ملک میں ہوں محنت ومشقت اور حلال روزی کو اپنا وطیرہ بنائیں۔

مختصر یہ ہے کہ آج کے وہ ممالک جہاں حکومت اور اکثریت دوسرے مذاہب کے حاملین کی ہے اور مسلمان وہاں اقلیت کی حیثیت سے جی رہے ہیں، حبشہ کے مہاجر صحابہ کے حالات سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے پرامن زندگی گذارنے کا منصوبہ بنا سکتے ہیں۔

ملک کے آئین اور عدالت سے حق حاصل کرسکتے ہیں اور اپنے حقوق وفرائض کو یقینی بنا سکتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

حوالہ جات

(۱) الصحیح المسلم، کتاب الایمان، باب فضل ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ
(۲) عبدالملک ابن ہشام، سیرۃ النبی جلد۱، ص:۳۳۹، دارالفکر ۱۹۸۱ء
(۳) ابن حجر عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، جلد۲، ص۳۵۹ مکتبہ مثنی بغداد
(۴) اسماعیل ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، جلد۴، ص۵۸۵ (سورہ الفیل) دارالخیر دمشق ۱۹۹۰ء
(۵) سیرۃ النبی جلد۱، ص۳۵۶ (۶) محمد حمیداللہ، خطبات بھاول پور، ص۶۳، نئی دہلی ۱۹۹۷ء
(۷) سیرۃ النبی جلد۱، ص۳۵۶ (۸) ایضاً، ۳۵۳، نیز دیکھیے فتح الباری، جلد۷، ص۱۴۳
(۹) ابن سعد، الطبقات الکبری، جلد۱، ص۲۰۴، بیروت ۱۹۶۰ء (۱۰) ایضاً، ص۲۰۶
(۱۱) ایضاً، نیز دیکھیے احمد بن محمد القسطلانی، المواہب اللدنیہ، جلد۱، ص۲۵۹، گجرات، سیرۃ النبی جلد۱، ص۳۵۳
(۱۲) سیرۃ النبی، جلد۱، ص۳۵۸، نیز ابونعیم اصفہانی، دلائل النبوۃ جلد۱، ص۸۲، دائرۃ المعارف النعمانیہ حیدرآباد ۱۳۲۰ھ
(۱۳) ایضاً، نیز دیکھیے مسند امام احمد بن حنبل حدیث نمبر۱۷۴۰، جلد۲، ص۳۵۶، دارالحدیث قاہرہ، ۱۹۹۵ء
(۱۴) الاصابہ فی تمییز الصحابہ، جلد۱، ص۲۳۷ (۱۵) سیرۃ النبی جلد۱، ص۳۵۸
(۱۶) دلائل النبوۃ جلد۱، ص:۸۰ (۱۷) سیرۃ النبی جلد۱، ص۳۵۹، نیز دیکھیے مسند امام احمد بن حنبل، حدیث نمبر۱۷۴۰
(۱۸) سیرۃ النبی جلد۱، ص۳۵۹ (۱۹) ایضاً، ص۳۶۰ (۲۰) ایضاً (۲۱) ایضاً
(۲۲) المواہب اللدنیہ جلد۱، ص۲۵۹ (۲۳) الطبقات الکبریٰ جلد۱، ص۲۰۷
(۲۴) مسند امام احمد بن حنبل، حدیث نمبر۴۴۰۰، جلد۴، ص۲۴۶
(۲۵) دلائل النبوۃ جلد۱، ص۸۱ (۲۶) سیرۃ النبی جلد، ص۳۶۰
(۲۷) المواہب اللدنیہ جلد۲، ص۸۵ (۲۸) خطبات بھاول پور، ص۲۰۸

ٹی وی پر علماء کرام کا آنا مثبت ومنفی پہلو

از: مولانا سعید احمد جلال پوری

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ آج کل میڈیا اور ٹی وی چینلوں پر یہودی لابی، ان کے وفاداروں اور نمک خواروں کا قبضہ ہے، وہ اسلام اور احکام اسلام کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کو تشدد پسند، دہشت گرد اور اسلام کو نا قابل عمل دین ومذہب باور کراتے ہیں، اسی طرح وہ روز مرہ مسائل اور عقائد ونظریات پر جو مکالمے دکھاتے ہیں، اس میں بھی باطل اور باطل پرستوں کے عقائد ونظریات کو حق وصواب اور اہلِ حق کے موقف کو اس طرح بے وزن کر کے پیش کرتے ہیں کہ سیدھا سادا قاری حق وسچ اور باطل وجھوٹ میں امتیاز نہیں کر پاتا، وہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے؛ بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ اور اہلِ حق سے وابستہ افراد بھی اپنے عقائد ونظریات کے سلسلہ میں شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں، اور یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہمیں جو کچھ بتلایا اور پڑھایا گیا تھا، شاید حقائق اس سے مختلف ہیں، ایسی پریشان کن صورت حال سے بے چین ہو کر، دین کا درد رکھنے والے مسلمانوں کی خواہش اور شدید تقاضا ہے کہ اہلِ حق علماء کو ان ٹی وی پروگراموں میں آنا چاہئے اور اس فتنہ کا مقابلہ اس میدان میں اتر کر کرنا چاہئے اور عوام کو اصل حقائق سے آگاہ کرنا چاہئے، اور ٹی وی، سی ڈیز اور کیبل چینلز کے جواز کا فتویٰ دے دینا چاہئے، چنانچہ ایسے ہی ملی درد رکھنے والے بعض علماء سے بھی سنا گیا ہے کہ اب تو ٹی وی، سی ڈیز اور کیبل چینلز کی اس دلدل اور کیچڑ میں گھس کر اس میں غرق ہونے والے مسلمانوں کو نکالنا چاہئے، اگر اس سے تغافل برتا گیا تو وہ دن دور نہیں جب اسلام اور اسلامی اقدار کا تشخص نابود ہو جائے۔

ان ہمدردانِ قوم ووطن اور دین وملت کا اصرار ہے کہ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کوئی ایسا اسلامی چینل کھولا جائے جس کو دیکھ کر مسلمان اپنا دین، مذہب اور ایمان وعقیدہ محفوظ رکھ سکیں، اور اس کے ذریعے مادر پدر آزاد اور لادین ٹی وی چینلوں کے زہر اگلتے پروگراموں سے نئی نسل کو محفوظ کیا جاسکے اور دین ومذہب، ایمان وعقیدہ اور علم وعمل کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر رکھ کر دنیا بھر کی مسلم

امت کی راہنمائی کی جاسکے۔

دیکھا جائے تو ان ''مخلصین'' کی فکر وسوچ اخلاص پر مبنی ہے، اور ان کا جذبہ صادق ہے، اور بادی النظر میں ایسا کرنے کی ضرورت بھی ہے، اس لئے کہ ٹی وی اور سی ڈیز کے مادر پدر آزاد پروگرام، لچر وواہیات ڈرامے، ننگی فلمیں اور حیا سوز مناظر اتنا نقصان نہیں پہنچا رہے، جتنا یہ نام نہاد دینی پروگرام مسلمانوں کے عقائد ونظریات کو برباد کررہے ہیں، اس لئے کہ کوئی شخص فلم کو نیکی اور ثواب سمجھ کر نہیں دیکھتا، اور نہ ہی اس کے کرداروں کو حق وصواب جان کر اپناتا ہے، بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی ان کو قبیح، بُرا اور گناہ سمجھ کر دیکھتا ہے، جب کہ اس کے برعکس ان نام نہاد پروگراموں کو دینی اور مذہبی پروگرام سمجھ کر دیکھا جاتا ہے اور ان کی روشنی میں ہی ناظرین اپنی زندگی کے خطوط متعین کرتے ہیں، اس لئے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ ٹی وی چینلوں کے نام نہاد دینی پروگرام نئی نسل کے لئے ننگی اور بلیو پرنٹ فلموں سے بھی زیادہ نقصان دہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کا سدباب کیونکر اور کیسے ہو؟ اس سلسلہ میں دو قسم کی آرا پائی جاتی ہیں، ایک طبقہ کا خیال ہے کہ ٹی وی چینل میں ثقہ علماء کو آنا چاہئے اور ٹی وی کے میدان میں اتر کر دشمنانِ دین سے دو بدو مقابلہ کرنا چاہئے یا پھر اپنا الگ ٹی وی چینل قائم کرکے اس کا توڑ کرنا چاہئے، جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا جاچکا ہے۔

مگر علماء امت کی ایک قابل اعتماد جماعت کو اس سے نہ صرف اختلاف ہے بلکہ شدید ترین اختلاف ہے، ان کا موقف ہے اور بالکل بجا موقف ہے کہ:

۱- ان السیئة لا تدفع بالسیئة. گناہ کا ازالہ گناہ سے نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا ٹی وی پر آکر ٹی وی کی خباثتوں کا سدباب کرنا، ایسا ہی غلط ہے جیسے پیشاب کی غلاظت کو پیشاب سے دھونا یا پیشاب کی ناپاکی کو پیشاب سے پاک کرنا، جیسے یہ غلط ہے ایسے وہ بھی غلط ہے۔

۲- ٹی وی اور سی ڈیز کا کوئی پروگرام تصویر کے بغیر نہیں ہوتا اور تصویر بنانا یا بنوانا مطلقاً ناجائز اور حرام ہے، اس پر آنحضرت ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، تصویر خواہ پرانے اور دقیانوسی زمانے کے لوگوں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہو، یا جدید سائنسی اور ترقی یافتہ دور کی، اس کی حرمت پر پوری امت کا اجماع ہے۔

۳- تصویر سازی پر آنحضرت ﷺ نے بدترین عذاب کی وعید ارشاد فرمائی ہے، اور فرمایا ہے کہ: قیامت کے دن تصویر بنانے والوں سے کہا جائے گا کہ دنیا میں تم نے جاندار کی تصویر بنا کر

میری ہمسری اور برابری کی کوشش کی تھی، لہٰذا آج اس تصویر میں روح پھونک کر اور اس کو زندہ کر کے دکھلاؤ، ظاہر ہے یہ انسانی اختیار میں نہیں ہوگا تو اس کی پاداش میں ان کو سخت ترین عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس وضاحت کے بعد کیا کوئی عقل مند انسان اس کی اجرأت کرسکتا ہے کہ جان بوجھ کر عذابِ الٰہی کو گلے لگائے؟

۴- چونکہ ٹی وی اور ڈی وی ڈی کی وضع اور ساخت ہی لہو ولعب کے لئے ہے، اس لئے ان کو دینی مقاصد کے لئے استعمال کرنا نہ صرف غلط ہے، بلکہ دین کی توہین و بے حرمتی کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ اگر شریعت مطہرہ نے شراب کے مخصوص برتن مثلاً حنتم، دباء، نقیر، مزفت کو پاک کر کے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی؛ بلکہ ان کو توڑنے کا صرف اس لئے حکم فرمایا کہ وہ شراب کی علامت اور ایک حرام مشروب کے لئے مخصوص وموضوع تھے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے وفد عبدالقیس کی آمد پر بطور خاص ان برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہے:

"ونهاهم عن اربع عن الحنتم والدباء والنقير والمزفت" (بخاری، ص:۱۳)

''یعنی آپ نے ان کو شراب کے لئے مخصوص وموضوع چار قسم کے برتنوں: حنتم، دباء، نقیر اور مزفت کے استعمال سے منع فرمایا تھا۔''

اگر شریعت مطہرہ اور پیغمبر اسلام نے ایک حرام وناپاک مشروب کے لئے مخصوص برتنوں یا شراب کی علامت شمار ہونے والے ظروف کو استعمال کرنے یا ان سے نفع اٹھانے کی اجازت نہیں دی، تو ٹی وی، ڈی وی ڈی یا اس طرح کی دوسری چیزیں جو لہو ولعب کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال ہی نہیں ہوتیں، ان سے نفع اٹھانے کی کیونکر اجازت ہوگی؟ یا ان کے ذریعہ دعوت وتبلیغ کی اجازت کیونکر دی جاسکتی ہے؟

۵- اسی طرح یہ منطق بھی ناقابلِ فہم ہے کہ دوسروں کو گناہ اور گمراہی سے بچانے کے لئے خود اسی گناہ اور گمراہی کی راہ اختیار کرلی جائے، جس سے دوسروں کو منع کیا جارہا تھا، کیا کوئی معمولی عقل وفہم کا انسان یہ گوارا کرسکتا ہے کہ ایک گناہ کو دور کرنے کے لئے دوسرے گناہ کا ارتکاب کیا جائے؟ جب کوئی شخص دوسرے کی زندگی بچانے کے لئے اپنی دنیاوی زندگی داؤ پر نہیں لگاسکتا تو محض اس امکان پر کہ شاید دوسرا راہِ راست پر آجائے، کیا اپنی آخرت کی دائمی زندگی برباد کی جاسکتی ہے؟ یا اس کو داؤ پر لگایا جاسکتا ہے؟ یا کوئی اس کے لئے تیار ہوگا؟ اگر کوئی عقلمند ایسا کرے تو شرعاً، اخلاقاً اس کی گنجائش ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو علماء کو اس

خودکشی کا درس کیوں دیا جاتا ہے؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا آنحضرت ﷺ سے لے کر آج تک کی چودہ صدیوں سے اس کی کوئی ایک آدھ مثال پیش کی جاسکتی ہے؟ کہ کسی نے دوسرے کی ہدایت کی خواہش پر خود گمراہی اختیار کرلی ہو، اگر ایک لمحہ کے لئے اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو کیا شریعت اس کی اجازت دیتی ہے؟ یا انسان اس کا مکلّف ہے؟ نہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔

۶- اگر علماء کرام اور مقتدیانِ ملت ٹی وی پر آنا شروع کردیں تو سوال یہ ہے کہ پھر عوام کو اس آلہ لہوولعب کی تباہ کاریوں سے کیسے بچایا جاسکے گا؟ بلکہ اس وقت تو معاملہ اور بھی مشکل اور سنگین ہوجائے گا، جب علماء کرام خود ٹی وی کی اسکرین پر تشریف فرما ہوں گے اور دوسروں کو اس کے دیکھنے اور استعمال کرنے سے منع فرمارہے ہوں گے، کیا اس وقت ان کا روکنا ممکن ہوگا؟ یا ان کی تلقین مؤثر ہوگی؟

اسی طرح دنیا بھر میں امت مسلمہ کی ایک قابل قدر جماعت آج تک اس کے استعمال کو ناجائز اور نئی نسل کے لئے مہلک وسم قاتل سمجھتی آئی ہے، کیا اس اجازت یا نرمی سے وہ متاثر نہیں ہوگی؟ کیا ان گھروں میں جدید تہذیب یا بے دینی کے داخلہ کے ذمہ دار وہ علماء نہیں ہوں گے جو ٹی وی کے جواز کے لئے کوشاں ہیں؟

۷- بالفرض اگر علماء کرام عوام کو اس سے روکنا بھی چاہیں، تو کیا عوام کو یہ کہنے کا حق نہیں ہوگا کہ جس طرح آپ دینی پروگراموں کے لئے ٹی وی پر تشریف لاتے ہیں... اور یہ جائز ہے تو... اگر ہم نے محض دینی پروگرام دیکھنے کی غرض سے ٹی وی خریدا ہے، اور اس غرض سے ٹی وی دیکھتے ہیں، تو یہ کیونکر ناجائز ہے؟ بتلایا جائے اس کا کیا جواب ہوگا؟

اگر بالفرض علماء کرام جائز پروگرام دیکھنے کے لئے ٹی وی کو جائز قرار دے دیں اور ٹی وی گھروں میں گھس جائے تو پھر اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس پر لچر، واہیات، فحش اور ایمان سوز پروگرام نہیں دیکھے جائیں گے؟ یا اس پر دنیا جہاں کی ننگی فلمیں نہیں دیکھی جائیں گی؟ کیا اس سے گناہ اور بدکاری کی راہ نہ کھل جائے گی؟ کیا گھر میں ٹی وی آجانے کے بعد جائز وناجائز کی تحقیق ثانوی درجہ میں نہیں چلی جائے گی؟

۸- اگر علماء کرام ٹی وی پروگراموں میں آنا شروع کردیں اور ٹی وی مباحثوں میں شریک بھی ہونا شروع کردیں تو اس کی کیا ضمانت ہے؟ کہ یہود وہنود کی اولاد، علماء کے افکار و ارشادات کو ہو بہو ٹی وی میں نقل بھی کردیں؟

جب کہ صورت حال یہ ہے کہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ جب کسی عالم دین نے حقائق کا اظہار کرنا شروع کیا تو نہ صرف اس کو بولنے کا موقع نہیں دیا گیا؛ بلکہ اس کی جو بات ٹی وی اور بین الاقوامی قوتوں کے ذوق ومزاج کے خلاف تھی، اسے سنسر کردیا گیا۔ چنانچہ طالبان حکومت کے موقع پر حضرت مولانا مفتی نظام الدی شامزی شہیدؒ اسی قسم کے ایک مکالمہ میں شریک ہوئے، تو انھوں نے خود بتلایا کہ مذاکرے کا میزبان پہلے تو مجھے بولنے نہ دے رہا تھا، جب میں نے بولنا شروع کیا تو اس نے بارہا میری بات کاٹنے کی کوشش کی، لیکن جب میں نے اس پر برہمی کا اظہار کیا تو اگرچہ اس نے مداخلت تو بند کردی، لیکن میرے انٹرویو کے وہ حصے جو حکومت اور بین الاقوامی قوتوں کے ذوق ومزاج کے خلاف تھے، حذف کردیئے گئے، چنانچہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے خود فرمایا کہ:

''میں نے سوچا تھا کہ شاید اس طرح عوام کے سامنے حقائق آجائیں گے...اور اسی لئے میں شریک بھی ہوا تھا...مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ میری سوچ صحیح نہیں تھی اور ایسے پروگراموں میں شریک ہونا درست نہیں؛ کیوں کہ ان مذاکروں کا مقصد حقائق کی نشاندہی نہیں؛ بلکہ حقائق کو مسخ کرنا ہوتا ہے۔''

۹- دنیا جانتی ہے کہ ٹیوی اور سی ڈیز کا مقصد اصلاح نہیں، بگاڑ ہے، بلکہ دیکھا جائے تو ٹی وی اور ڈی وی ڈی کا مقصد مغربی تہذیب وتمدن اور لادین کلچر کا فروغ ہے، ظاہر ہے جس پروگرام میں دین وشریعت اور اسلامی تہذیب وتمدن کی صحیح صحیح نشاندہی کی جائے گی، اسے یہودی لابی اور ان کے ایجنٹ کیونکر برداشت کرسکیں گے؟

۱۰- اگر بالفرض مسلمان اپنا ٹی وی چینل ایجاد کرلیں تو سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جانداروں کی تصویر کے ہوتے ہوئے وہ کیونکر جائز ہوجائیگا؟ اور تصویر کے بارہ میں حکم شرعی پہلے آچکا ہے۔

چلو اگر ایک منٹ کے لئے تصویر کو برداشت بھی کرلیا جائے تو کیا عام ناظرین ایسے ٹی وی چینل کو دیکھنا پسند کردیں گے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو بتلایا جائے کہ محراب ومنبر کی آواز پر کان کیوں نہیں دھرے جاتے؟ حالانکہ محراب ومنبر سے بھی یہی بات کہی جاتی ہے، آپ ہی بتلائیے کہ جو بات محراب ومنبر سے کہنے پر نہیں سنی جاتی وہ ٹی وی سے کیوں سنی جائے گی؟ دراصل لوگ ٹی وی دیکھتے ہی صرف اس لئے ہیں کہ ٹی وی اسکرین پر اور ''بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے'' جو محراب ومنبر سے نہیں دیکھا جاسکتا، لہٰذا ایسا ٹی وی جس میں عوام کی مطلوبہ رنگینی نہیں ہوگی اس کو کوئی بھی نہیں دیکھے گا۔

عوام کی اس رنگین مزاجی پر میراثی کا وہ لطیفہ بالکل فٹ بیٹھتا ہے، جس میں اس نے اہلِ

جنت وجہنم کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے سامعین کومخاطب کرکے کہا:

''ارے سنتے ہو! ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ میں مرگیا ہوں، مجھے دفن کردیا گیا، میرا حساب وکتاب ہوا تو فرشتوں نے کہا: تیرے گناہ اورنیکیاں برابر ہیں، جہاں چاہے، تجھے بھیج دیتے ہیں، میں نے مولویوں سے سن رکھا تھا کہ جنت بہت اچھی جگہ ہے، اس لئے میں نے کہا: مجھے جنت بھیج دو، جب مجھے جنت لے جایا گیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، وہاں کوئی رونق تھی نہ راگ ورنگ تھا اور نہ تفریح طبع کا دوسرا سامان، پس مسجد کے میاں جی، چند داڑھیوں والے جن کے ہاتھ میں لوٹے اور مصلّے تھے، یا پھر علاقے کے غریب غربا اور بس۔

میں نے فرشتوں سے کہا: اس سے کوئی اچھی جگہ بھی ہے؟ انھوں نے کہا اس سے اچھی جگہ تو کوئی نہیں، البتہ اگر چاہو تو تمہیں جہنم دکھاسکتے ہیں، میں نے کہا ضرور! چنانچہ جب مجھے جہنم لے جایا گیا تو کیا دیکھتا ہوں: اپنے گاؤں کے چودھری صاحب، ملک صاحب، خان صاحب علاقہ کے سارے نامی گرامی لوگ موجود تھے، وہاں کچھ گلوکارائیں گانا گارہی تھیں اور کچھ اداکارائیں ناچ بھی رہی تھیں، محفل جمی ہوئی تھی، چلم بھری تھی اور سارے روشن خیال اور ترقی پسند دوست و احباب جمع تھے، وہاں جاکر تو مزہ ہی آگیا۔''

اگرچہ یہ ایک لطیفہ ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو عوام آج کل اس رنگینی کی تلاش میں ہیں چاہے اس کے لئے ان کو جہنم ہی کیوں نہ جانا پڑے اور ان کو سادگی اور خالص دین وشریعت کے پروگرام ناقابل قبول ہیں، چاہے اس کے عوض جنت ہی کیوں نہ ملتی ہو۔

چلو اس کو بھی مان لیا جائے کہ لوگ ''خالص دینی اور شرعی ٹی وی'' کو دیکھیں گے تو سوال یہ ہے کہ یہودی ایجنٹ اور بین الاقوامی لابیاں اس چینل کو چلنے بھی دیں گی؟ نہیں ہرگز نہیں، چنانچہ ''الجزیرہ'' ٹی وی کی نشریات کا جام کیا جانا سب کے سامنے ہے، اس کے علاوہ کیا وہ ٹی وی چینل پوری دنیا کے ٹی وی قوانین کی مخالفت مول لے کر اپنا کام جاری رکھ سکے گا؟ نہیں، نہیں، ہرگز نہیں، چنانچہ اس کے لئے افغانستان کی طالبان حکومت بطور مثال کافی ہے کہ امریکا بہادر اور اس کے اتحادیوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ صرف اور صرف اس لئے بجائی ہے کہ وہ بین الاقوامی کافرانہ نظام کا حصہ بننے کے لئے تیار نہیں تھی، ٹھیک اسی طرح ایسی ٹی وی چینل کا بھی حشر ہوگا۔

۱۱- رہی یہ بات کہ اربابِ کفر والحاد نے اگر ٹی وی کو اسلام کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا ہے تو کیوں نہ ہم بھی اس کو اشاعت اسلام کے لئے استعمال کریں؟ نظر بظاہر یہ جذبہ نیک ہے، مگر اس میں مشکل وہی پیش آتی ہے کہ اشاعت اسلام کے لئے کسی ناجائز اور حرام ذریعہ کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر اشاعت اسلام کے لئے ناجائز ذرائع کے اپنانے کی اجازت ہوتی تو چوروں کی اصلاح کے لئے چوروں اور زانیوں کی اصلاح کے لئے زانیوں کے گروہ میں شامل ہونا بلکہ کافروں کی اصلاح کے لئے کافروں کے گروہ میں شامل ہونا بھی جائز ہوتا، مگر دنیا جانتی ہے کہ دنیا کا کوئی مہذب قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔

اس کے علاوہ اگر بالفرض اشاعت اسلام کے لئے کسی منکر، ناجائز اور حرام کو اپنانے کی اجازت بھی دے دی جائے تو کیا آئندہ کے لئے نھی عن المنکر کا دروازہ بند نہیں ہوجائے گا؟ اس لئے کہ ہر مجرم اپنے جرم کی یہی تاویل اور جواز پیش کرے گا کہ میں نے یہ سب کچھ اسلام کی اشاعت کے لئے کیا ہے، چنانچہ جہاں کہیں کوئی چور، ڈاکو، زانی، شرابی یا قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا، وہ یہ کہہ کر چھوٹ جائے گا کہ میں چور، زانی، ڈاکو، شرابی اور قاتل نہیں ہوں، بلکہ میں نے تو ان لوگوں کی اصلاح کے لئے یہ شکل اختیار کر رکھی ہے، بتلایا جائے اس سے سارا معاشرہ جرائم اور گناہوں کی آماجگاہ نہیں بن جائے گا؟

۱۲- اشاعت اسلام کے لئے ہم اس کے تو مکلّف ہیں کہ جتنا حلال وجائز اسباب و ذرائع مہیا ہوں ان کو ممکنہ حد تک استعمال کریں اور کفر و باطل کی راہ روکنے کی کوشش کریں، لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ ہم خواہ مخواہ نت نئے انداز اور جائز و ناجائز حربے استعمال کرنے کی سعی وکوشش میں ہلکان ہوا کریں۔

اگر اس کی ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو اس کی اجازت دیتے اور وہ تمام اسباب وذرائع جو کفر وشرک کی اشاعت میں استعمال ہوتے ہیں، ان کی پیغمبر ﷺ کو بھی اجازت ہوتی، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو اغوائے انسانی کے لئے اولاد آدم کے قلوب میں وساوس ڈالنے، دور بیٹھ کر ان پر تسلط حاصل کرنے کا اختیار دیا ہے، مگر نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو یہ اختیار نہیں دیا گیا، اسی طرح حدیث نبوی کے مطابق: شیطان انسان کے بدن میں ایسے

دوڑتا ہے جیسے خون دوڑتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا آنحضرت ﷺ کو انسانی خون میں دوڑنے کی اجازت تھی؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

ایسے ہی شیطان انسانی قلوب واذہان کی اسکرین پر اپنے وساوس کے ذریعے گناہوں اور بدکاریوں کی ننگی اور بلیو پرنٹ فلم دکھا کر ان کو گناہوں اور بدکاریوں پر آمادہ کرتا ہے، جبکہ آنحضرت ﷺ کو انسانی قلوب واذہان پر تسلط نہیں دیا گیا بلکہ فرمایا گیا: "ان انت الا نذیر" (فاطر:۲۳) ''آپ تو صرف ڈرسنانے والے ہیں'' اسی طرح دوسری جگہ فرمایا: "لست علیھم بمصیطر" (غاشیہ:۲۲) ''یعنی آپ ان کے نگراں نہیں ہیں کہ نہ مانیں تو آپ سے پوچھ ہوگی''۔

اگر اس کی اجازت یا ضرورت ہوتی جس قدر شیطان کو کفر وشرک کی اشاعت کے لئے یہ قوت واستعداد دی گئی تھی، اس سے زیادہ ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ کو بھی اشاعت اسلام کے لئے ان چیزوں سے نوازا جاتا، مگر جب اللہ تعالیٰ نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی تو کیا نعوذ باللہ! ہم اللہ تعالیٰ سے زیادہ اشاعت اسلام کے خواہاں اور انسانوں کی ہدایت وراہنمائی کے لئے فکرمند ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو ہمیں شرعی حدود سے نکل کر اشاعت اسلام کے لئے زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔

۱۳- اسی طرح ٹی وی کے جواز اور ضرورت کیلئے یہ استدلال بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ اگر ہم نے ٹی وی پر آکر مسلمانوں کی راہنمائی نہ کی تو لادین قوتیں اس کو دین کے بگاڑنے کیلئے استعمال کریں گی؟ اور اسلام کا حلیہ بگڑ جائیگا اور اسلام اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہے گا۔

اس لئے کہ سنت اللہ یہی چلی آئی ہے کہ بے شک اسلام کو ڈھانے اور مٹانے کی کوششیں تو ضرور ہوں گی اور ہوتی بھی آئی ہیں، مگر اسلام ختم ہوجائے یا اس میں تحریف ہوجائے یا اس کا حلیہ بگڑ جائے یا اسلام اپنی اصلی حالت میں نہ رہے، ایسا ناممکن ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ: ''مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی رہے گی جو اسلام کو اصلی حالت پر برقرار رکھنے میں محنت و کوشش کرتی رہے گی، اور اہل ہوا و بدعت کی اڑائی دھول کو صاف کرتی رہے گی اور ان پر کسی مخالفت گر کی مخالفت کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔''

چنانچہ سوا چودہ سو سال ہوگئے ہیں، الحمدللہ! آج بھی اسلام اسی طرح تروتازہ ہے۔ حتی کہ شیطان کے انسانی قلوب پر تسلط حاصل ہونے کے باوجود اگر آج تک اسلام محفوظ ہے تو آئندہ بھی انشاء اللہ محفوظ ہی رہے گا، اور آئندہ بھی اس کو تحریف سے بچایا جائے گا۔

۱۴- ٹی وی اور ویڈیو فلم سے تبلیغ کا کام لینا یوں بھی نا قابل فہم ہے کہ ٹی وی دیکھنے والے کسی نیک جذبے اور اصلاح کی غرض سے یہ پروگرام نہیں دیکھتے بلکہ تفریح طبع کے لئے یہ پروگرام دیکھے جاتے ہیں، اس لئے کہ دنیا جانتی ہے کہ ٹی وی پر آنے والے لوگ قابل اعتماد اور ثقہ نہیں بلکہ بازاری اور شہرت کے خواہاں ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج تک نہیں سنا گیا کہ کسی نے ٹی وی کی ''برکت'' سے اسلام قبول کیا ہو، اس سلسلہ میں حکیم العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کا ایک جواب پڑھئے اور سر دھنئے!

''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ویڈیو فلم اور ٹی وی سے تبلیغ اسلام کا کام لیا جاتا ہے، ہمارے یہاں ٹی وی پر دینی پروگرام بھی آتے ہیں لیکن کیا میں بڑے ادب سے پوچھ سکتا ہوں کہ ان دینی پروگراموں کو دیکھ کر کتنے غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے؟ کتنے بے نمازیوں نے نماز شروع کر دی؟ کتنے گناہ گاروں نے گناہوں سے توبہ کر لی؟ لہٰذا یہ محض دھوکا ہے، فواحش کا یہ آلہ جو سرتاپا سرنجس العین ہے اور ملعون ہے اور جس کے بنانے والے دنیا و آخرت میں ملعون ہیں وہ تبلیغ اسلام میں کیا کام دے گا؟ بلکہ ٹی وی کے یہ دینی پروگرام گمراہی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ ہیں، شیعہ، مرزائی، ملحد، کمیونسٹ اور ناپختہ علم لوگ ان دینی پروگراموں کے لئے ٹی وی پر جاتے ہیں اور اناپ شناپ جو ان کے منہ میں آتا ہے کہتے ہیں، کوئی ان پر پابندی لگانے والا نہیں اور کوئی صحیح وغلط کے درمیان تمیز کرنے والا نہیں، اب فرمایا جائے کہ یہ اسلام کی تبلیغ واشاعت ہو رہی ہے یا اسلام کے حسین چہرے کو مسخ کیا جا رہا ہے؟؟ رہا یہ سوال کہ فلاں یہ کہتے ہیں اور یہ کرتے ہیں، یہ ہمارے لئے جواز کی دلیل نہیں۔'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج:۷، ص:۳۹۸)

۱۵- علماء کو ٹی وی پر آنے کے مشورہ کو اس زاویہ سے بھی دیکھنا چاہئے کہ خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسروں کی اصلاح کی فکر میں ٹی وی پر آنے والے حضرات خود ہی بے وزن ہو جائیں، اس لئے عین ممکن ہے کہ یہ بھی ایک شیطانی چال ہو کہ جو حضرات ٹی وی پر آنا شروع کریں گے کم از کم وہ متفق علیہ تو نہیں رہیں گے، خصوصاً جو حضرات ٹی وی کی حرمت کے قائل ہیں، ان کے ہاں ایسے حضرات کے کسی قول، فعل اور عمل بلکہ فتویٰ کا کوئی اعتبار نہیں رہے گا، گویا دوسروں کی اصلاح ہو یا نہ ہو، کم از کم یہ تو متنازعہ بن جائیں، اور کیونکہ ہادیانِ قوم ووطن کا متنازعہ بن جانا، شیطان

اوراس کے پجاریوں کے لئے بہت بڑی فتح ہے۔اس لئے کہ باطل پرستوں کی کبھی یہ خواہش نہیں رہی کہ مسلمان، کافر یا مشرک بن جائے، بلکہ ان کی خواہش اور کوشش یہ رہی ہے کہ مسلمان، مسلمان نہ رہے، یا کم ازکم قابل اعتماد نہ رہے، اگر ایسا ہوتو سوچنا چاہئے کہ ٹی وی پر آنے والے اوراس کے جواز کے قائل علماء جب ٹی وی پر آئیں گے تو وہ اپنے موقف کی حقانیت وصداقت اور مخالفین کی تغلیط فرمائیں گے، ٹھیک اسی طرح جو حضرات مخالف ہوں گے، وہ بھی اپنے موقف کو دلائل وشواہد سے مبرہن کریں گے، اور اپنے مخالفین کے موقف کی تغلیط کریں گے... جو ان کا فطری اور منطقی حق ہے... یوں اختلافات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجائے گا، اور اہل حق کے آپس میں دست وگریبان ہوتے ہی اسلام دشمنوں کا مقصد پورا ہوجائے گا، کیونکہ وہ دراصل مسلم امہ اور علماء کے اتفاق واتحاد سے ہی سب سے زیادہ خائف اور الرجک ہیں۔

۱۶- ٹی وی پر وعظ وبیان اور تقریر ومکالمہ کی ضرورت پر زور دینے والوں کو اس انداز سے بھی سوچنا چاہئے کہ جس اسٹیج اور جس جگہ پر عصیان وطغیان پر مبنی حیاء سوز اور ایمان کش فلمیں، لچر واہیات پروگرام اور گانے گائے جاتے ہوں اور وہاں ''خدا کے لئے'' جیسی خالص کافرانہ اور ملحدانہ فلمیں اور ڈرامے دکھائے جاتے ہوں، وہاں اللہ کا پاک، پاکیزہ کلام، احادیث مبارکہ اور قرآن وسنت کی تعلیمات پر مبنی لیکچروں کا سنانا اور دکھانا جائز بھی ہوگا؟ کہیں یہ قرآن وسنت اور دین وشریعت کی توہین وتنقیص یا سوء ادبی تو نہیں ہوگی؟

کیونکہ سیّد ابراہیم الدسوقی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ:

''اپنے منہ کو تلاوت قرآن مجید کے لئے پاک وصاف رکھا کرو، کیونکہ جو شخص منہ کو حرام بات یا حرام کھانے سے آلودہ کرکے بغیر توبہ کے قرآن مجید پڑھنے لگے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی قرآن کو ناپاکی پر رکھے، ایسے آدمی کو جو حکم ہونا چاہئے وہ سب کو معلوم ہے، بعض اولیاء اپنے مشاہدے میں اس کو باطنی گندگیوں سے زیادہ پلید دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔'' (معارف بہلوی ص:۴۱، ج:۴)

نیز اس پر بھی غور فرمایا جائے کہ گندی اور ناپاک جگہ اور غلاظت خانہ یا باتھ روم میں اللہ کا ذکر کرنا اگر ممنوع ہے تو ٹی وی ایسے غلاظت کدہ میں کیا اس کی اجازت ہوگی؟

واللّٰہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین.

قیام دارالعلوم دیوبند کا دینی وسیاسی پس منظر

از: پروفیسر بدرالدین الحافظ
جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

ایشیا کی مایۂ ناز دانش گاہ اور ہزاروں فیض یافتگان علوم اسلامیہ کی مادر علمی دارالعلوم دیوبند جس کو آج بجا طور پر از ہرالہند کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، کن حالات اور اسباب کی بنا پر وجود میں آئی اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں بہت دور تک تاریخ کی چھان بین کرنی ہوگی کیونکہ اس کی جڑیں ہندوستانی تاریخ کی کئی صدیوں میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس سلسلے میں بظاہر تو ۱۶۱۵ء میں انگلستان کے فرماں روا جیمز اوّل نے اپنے سفیر سر ٹامس رو کو جہانگیر کے دربار میں بھیج کر تین سال کے لیے تجارتی مراعات حاصل کی تھی۔ جو تجارت کے بہانے ہندوستان میں عیسائیت کی جڑیں جمانے کا عیارانہ حربہ تھا ع

سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

مگر حقیقت میں مختلف ملکوں کی عیسائی مشنریز یہاں بہت پہلے سے سرگرم عمل تھیں اور کم فہم نادان عوام کو لالچ دے کر یا زبردستی مسیحیت میں داخل کرنے کا عمل جاری تھا۔ اس کے بعد شاہ جہاں کے عہد میں انگریزوں نے ہوگلی بنگال کے قریب کچھ دیہاتوں کو اپنی گرفت میں لے کر عیسائی تبلیغ کا کام زور وشور سے شروع کیا اور رفتہ رفتہ یہ تحریک شہری علاقوں میں پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ جو کمزور آدمی نظر آتا، اسے عیسائی بنا کر انگلستان بھیج دیا جاتا۔ مرنے والوں کا مال ضبط کرلیا جاتا، نابالغ ہندو مسلمان یتیم بچوں کو عیسائی بنا کر غلام بنالیا تھا۔

۱۶۹۳ء میں کچھ مسلمان حج کے لیے جارہے تھے، ان کو گرفتار کیا۔ جو مسلمان جہاز پر تھے، ان کو لوٹنے کے بعد برہنہ کیا۔ مستورات کی بے حرمتی کی جس کی وجہ سے شرم کی ماری بہت سی عورتیں ڈوب کر مرگئیں۔(۱) اس کے علاوہ عیسائی مذہب پھیلانے کے لیے پرتگیزیوں اور

انگریزوں نے بڑے رکیک ہتھکنڈے بھی استعمال کرتے ہوئے اپنی لڑکیوں کو بادشاہوں کے حرم میں پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ چنانچہ اکبر بادشاہ کی بیوی مریم زمانی، عالمگیر کی بیوی مسیح النساء، شاہ عالم کی بیوی مس ہنری، اور نصیرالدین حیدر شاہ کی بیوی مخدرہ عالیہ ہوئیں جنھوں نے عیسائی مذہب کی ترویج وترقی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، مگر ان تمام کوششوں کے باوجود عام طور پر مسلمانوں نے اس کا اثر قبول نہیں کیا۔ سوائے گنے چنے چند کمزور لوگوں کے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں مسلمانوں کا معاشی اور مذہبی نظام کافی حد تک مستحکم تھا۔ لیکن جوں ہی بادشاہ عالمگیر کا وصال ہوا، یہاں سے مسلمانوں کا اقتدار کمزور ہوتا چلا گیا۔ ذہنوں پر بے حسی، بے بسی طاری ہوگئی۔ پھر ۱۷۴۷ء میں مدراس پر انگریزوں کے قبضے نے حالات میں اور ابتری پیدا کردی۔

اب انگریزوں کا معمول بن گیا تھا کہ جس مقام پر قبضہ کرتے، وہاں برطانوی، امریکی اور جرمنی عیسائی مشنریوں کی ٹڈی دل فوج شہروں، قصبوں، دیہاتوں اور محلوں میں پھیل جاتی اور مسیحی مذہب کی ہر ممکن طریقے سے تبلیغ کرتی۔ اسکول کھولے جاتے، اسپتال قائم کیے جاتے، طالب علموں اور مریضوں میں ہر طریقے سے نصرانیت کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی اور اسلام کی تہذیب وتحقیر کی بھرپور کوشش ہورہی تھی۔ اسی طرح ۱۸۹۱ء میں بشپ کالج کلکتہ میں قائم کیا گیا۔ اس کے ہر طالب علم کو یہ قسم کھانی پڑتی تھی کہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مشنری کے کاموں میں حصہ لے گا۔ اور یہی نہیں دوران تعلیم لڑکوں کو انجیل کے اقتباسات پڑھائے جاتے اور ان سے سوال کیے جاتے کہ تمہارا خدا کون ہے؟ نجات دہندہ کون ہے؟ اس کا جواب عیسائی مذہب کے مطابق بتانے والے کو انعام دیا جاتا۔

اسکولوں کالجوں کے علاوہ فوجیوں کو بھی اپنے مذہبی شعار اختیار نہ کرنے پر مجبور کیا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۸۰۸ء میں پہلی بار مقام ویلور مدراس میں ایک کمانڈر ان چیف نے فوجی قوانین میں تین باتوں کا اضافہ کیا اور حکم دیا، فوجی اپنے ماتھے پر تلک نہ لگائیں، داڑھیاں منڈوائیں اور اپنی ہندوستانی وضع کی ٹوپیاں چھوڑ کر انگریزی ہیٹ استعمال کریں۔

اس کے علاوہ عام محلوں سڑکوں اور بازاروں میں جو عیسائی مذہب کی تبلیغ کی جارہی تھی بعض کمزور مسلمانوں پر اس کا اثر ہونے لگا تھا جیسا کہ عمادالدین پانی پتی مع اپنی اولاد کے عیسائی ہوگئے اور ان کے والد چراغ الدین، بھائی خیرالدین نے بھی اسلام کو خیرباد کہہ کر عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا۔ اسی طرح صفدر علی بھی اسلام سے برگشتہ ہوکر عیسائی ہوگئے تھے۔

مگر عیسائیوں کی ان تمام کوششوں کے باوجود جن لوگوں نے اپنی ذات مصالح کی بنا پر اس مذہب کو قبول کیا، ان کی تعداد بہت کم تھی، جس کا خود عیسائی مبلغ گارسان رتاسی اپنے ایک خطبہ میں ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہندوستان میں ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے دین مسیح کو قبول کیا۔(۲) اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی شکوہ کرتا ہے کہ یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو لوگ اسلام میں شامل ہو رہے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی بعض عیسائی نہ معلوم کیوں اسلام قبول کر کے اور اپنی وضع قطع بدل کر اسلام کی تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں۔(۳)

غرض تبدیلیٔ مذہب کے واقعات اور عیسائیوں کی بھرپور کوششوں کے علاوہ یہاں مرہٹوں جاٹوں اور سکھوں کی مسلم مخالف جنگجویانہ سرگرمیوں نے بھی مسلمانوں کے لیے مشکلات میں اور اضافہ کر دیا تھا جس کو دردمند قلوب بخوبی محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نجیب الدولہ کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں ''اگر غلبہ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام فراموش کر دیں گے اور تھوڑا ہی زمانہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کر سکے گی''۔(۴)

اس کے علاوہ ۱۷۴۲ء میں جب حضرت شاہ صاحب زیارت حرمین شریفین سے واپس تشریف لائے اور یہاں کے معاشرہ کا حال دیکھا تو تڑپ اٹھے کیونکہ اس دور میں حکمراں طبقہ اپنی رنگ رلیوں میں مست تھا۔ علماء وقت جو کچھ درس وتدریس کا کام کر رہے تھے، وہ بھی دین کی روح سے کوسوں دور تھے اور عوام تو بے روک ٹوک شکم پروروں کے چکر میں افعال دین سمجھ کر بے دینی کے غلیظ تالابوں میں غوطہ زن تھے۔ ان مندرجہ بالا حالات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں دعوتِ دین اور تبلیغ اسلام کی صحیح کوشش کی کتنی اہم ضرورت تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو باصلاحیت علماء نے عیسائی مشنریز اور نصرانیت کے مبلغین پر قدغن لگانے اور بے دینی کے سیلاب کو روکنے کی بھرپور کوشش کی اور ان کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸۴۴ء میں مولانا آل حسنؒ نے ردنصاریٰ پر ایک کتاب استفسار شائع کی، جس میں پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق کے اعتراضات کے جوابات بھی تھے۔

اس کے بعد مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے ردنصاریٰ پر بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں تحریر فرمائیں جن میں اظہار الحق میزان الحق کا ایسا بھرپور اور مدلل جواب تھا جس کا اب تک توڑ نہ کیا جاسکا اور آج بھی اس کے تراجم مختلف ملکوں میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگرہ میں پادری فنڈر کی کوٹھی پر اسلام کی حقانیت ثابت کرنے اور عیسائیت کی تکذیب کے لیے خود پہنچے اور اس کو مناظرہ کی دعوت دینے کی کوشش کی۔ اتفاقاً وہ اس وقت نہیں ملا تو بعد میں اپریل ۱۸۵۴ء میں ایک دوروزہ مناظرہ کا آگرہ میں اہتمام کیا گیا جس میں پادری فنڈر نے اعتراف کیا کہ انجیل مقدس میں تحریف ہوئی ہے۔ اس تاریخی مناظرہ سے صرف ہندوستان کے مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ یہاں کی ہر قوم میں انگریزوں کے خلاف ایک بیداری پیدا ہوئی اور یہ مناظرہ ذہنی آمادگی پیدا کرنے کے لیے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ مولانا رحمت اللہ کے حامیوں نے کس طرح عیسائیوں کی کوشش کا قلع قمع کیا اس کی تفصیلات مولانا امداد صابری مرحوم کی کتاب فرنگیوں کے جال میں دیکھی جاسکتی ہے۔ پھر اس سلسلے میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مشہور مناظرے، شاہجہانپور، روڑکی وغیرہ کی طرف اشارہ کافی ہے۔ جن کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔

مختصراً یہاں پر یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ دینی مدارس کے قیام کے اسباب میں انگریزوں کے مندرجہ ذیل عزائم بھی کارفرما تھے جیسا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر مکنگلیس نے آغاز ۱۸۵۷ء میں دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ خداوند نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیحؑ کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ لہٰذا ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت پورے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہیے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہ کرنا چاہیے۔(۵)

پھر اس عزم وارادوں کی تکمیل کے لیے انگریزوں نے تبلیغ کے علاوہ جو تدابیر اختیار کیں ان میں مال ومنال چشم غزال نوکریوں کا لالچ جیسے ہر ہتھکنڈے کو اختیار کیا گیا تھا۔ انگریزی اسکولوں میں مفت تعلیم اور غربت وافلاس میں ہر ممکن اضافہ کرکے عیسائیوں کی جھولیوں میں آنے کے لیے مجبور کرنا شامل تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ علوم اسلامیہ کو مٹانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی جیسا کہ شاہ عبدالرحیمؒ کا قائم کردہ مشہور مدرسہ رحیمیہ مہندیان میں ختم کیا گیا۔

پھر لارڈ میکالے نے صاف لفظوں میں کہہ ڈالا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے اعتبار سے انگلستانی۔(۶)

ان تمام حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد جو ہم بارہویں صدی ہجری میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور آپ کے اہل خاندان کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

ایک طرف تو آپ نے رجوع الی القرآن کے مقصد سے آسان تفہیم کے لیے فتح الرحمٰن نامی فارسی ترجمہ کی خدمت انجام دی اور آپ کے صاحبزادوں میں حضرت شاہ عبدالعزیز نے فارسی میں ایک عظیم تفسیر لکھنی شروع کی جو مکمل نہ ہوسکی اور اس تشنگی کا آج بھی اہل علم میں احساس پایا جاتا ہے۔ پھران کے بعد آپ کے برادران حضرت شاہ عبدالقادر وفات ۱۲۳۰ھ اور شاہ رفیع الدین وفات ۱۲۳۳ھ نے بامحاورہ اور تحت اللفظ ترجمے تحریر فرمائے جو بعد کے تفسیری کام کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دینی مدارس کے نصاب کے لیے آپ نے مختلف علوم وفنون پر کتابیں مدون فرمائیں جو آئندہ مدارس کے لیے ایک مشعل ہدایت ثابت ہوئیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی حالات سے بھی یہ لوگ بے حد فکرمند تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ وفات ۱۲۳۹ھ نے انگریزوں کی دین مخالف تحریکات کو دیکھتے ہوئے جب یہ سنا کہ مغلوں کی لڑکھڑاتی سلطنت کے شہنشاہ شاہ عالم کی حکومت اب دہلی کے پالم علاقہ تک محدود رہ گئی ہے تو ۱۸۰۳ء میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا، جس نے ایک طرف مسلمانوں کے حوصلے بلند کردیے اور حریت وطن کی خاطر سینہ سپر ہوجانے کا جذبہ عطا کیا۔ دوسری طرف انگریز حکومت اس فتوے سے لرزہ براندام ہوگئی، کیونکہ وہ ولی اللّٰہی خاندان کے فتوے کی اہمیت سے بخوبی واقف تھی۔ (۷)

اس کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے ہمنوا علماء کرام نے ایک انقلابی جماعت کی بنیاد ڈالی جس کے تیسرے امام حضرت شاہ عبدالغنیؒ اور آپ کی وفات کے بعد چوتھے امام حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی (وفات ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء) (۸) مقرر ہوئے۔ نیز آپ کے شرکا میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (وفات ۱۳۲۳/۶/۸ھ) اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ خاص طور پر شامل تھے۔ ان حضرات نے ایک طرف عملاً انگریز کے خلاف جہاد کا آغاز کیا جو بہمہ وجوہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوا۔ دوسری طرف حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی (وفات ۱۲۷۲ھ- ۱۸۸۰ء) اور آپ کے رفقاء نے اپنی فراست ایمانی اور دیدہ بصیرت سے اندازہ لگایا تھا کہ ان نازک حالات میں اگر مسلمانوں کو قرآن وحدیث اور دیگر علوم اسلامیہ سے واقف کرانے کا کوئی معقول اور مستحکم بندوبست نہ کیا گیا تو سخت خطرہ ہے کہ مسلمان کہیں نصرانیت کے جال میں نہ پھنس جائیں۔ بس انھیں خیالات کے پیش نظر مورخہ ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ بمطابق ۱۸۶۷ء بروز جمعرات کو دیوبند کی مبارک سرزمین پر چھتہ کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے ہدایت کا یہ

شجر طوبیٰ وجود میں آیا۔اس طرح ابتدا میں یہ مدرسہ عربی اور پھر دارالعلوم کے معروف نام سے موسوم ہوا۔

اس کی مقبولیت کا اندازہ صرف ان اعداد وشمار سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۲۸۷ھ سے لے کر ۱۴۲۷ھ تک یعنی تقریباً ۱۴۴ سال میں ایک لاکھ پچھتّر ہزار اٹھارہ فضلاء دارالعلوم سے فارغ ہوکر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکے ہیں۔(۹) اور دین مبین کی والہانہ خدمت کا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہیں۔اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی مساعی جمیلہ کو قبولیت سے نوازے اور دارالعلوم کا چشمہ فیضان تشنگان علوم دینیہ کو سیراب کرتا رہے۔آمین۔

❁ ❁ ❁

حوالہ جات

(۱) سوانح علماء دین دیوبند اوّل،ص:۳۸۲۔

(۲) تاریخ ہند۔ذکاء اللہ (جلد اوّل) ص:۲۹۹۔بحوالہ سوانح علماء دیوبند اوّل،ص:۳۸۸ تاریخ ہند۔

(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی۔شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات،ص:۲۲-۲۳۔

(۴) حوالہ سابقہ

(۵) علماء حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے،ص:۱۶ بحوالہ سوانح علماء دیوبند (جلد دوم) ص:۲۲۔

(۶) اخبار مدینہ،بجنور۔اشاعت ۲۸ رجنوری ۳۶۔بحوالہ سوانح علماء دیوبند (۲) ص:۲۵۔

(۷) فتاویٰ عزیزیہ جلد:۱،ص:۷۔بحوالہ باغی ہندوستان ترجمہ:الثورۃ الہندیہ،ص:۲۰۸۔الجمع الاسلامی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

(۸) ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ،مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی۔۳،اشاعت جنوری ۲۰۰۸ء ۔

(۹) فیاض وفا،دارالعلوم دیوبند ۱۴۲۷ھ۔

❁ ❁ ❁

دارالعلوم دیوبند
میرے چند مشاہدات و تجربات

از: ڈاکٹر ظہور الحق

میرے خاندان کے افراد دینی علوم کی تحصیل کے لیے مظاہر العلوم سہارنپور جایا کرتے تھے۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جو عربی اور دینی تعلیم کی تکمیل کے لیے دارالعلوم، دیوبند گیا۔ اِس مخزنِ علوم اور مایۂ ناز ادارے کی کشش کے جہاں بہت سے اسباب تھے ان میں سے ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ یہاں کے اساتذۂ کرام اور طلبہ نے برطانوی استعماریت اور اس کے تند و تیز طوفان کے خلاف جس جہد مسلسل اور بلند حوصلگی سے کام لیا اور اپنی ملت کی بقا، قوم و ملک کے تحفظ اور ایک علمی، اخلاقی اور ملی نصب العین کے لیے انھوں نے جو بے لوث قربانیاں دیں اُن سے میرے دل و دماغ پر ایسے اثرات مرتب ہوئے تھے جن کی گرفت روز بروز مضبوط ہوتی جارہی تھی اور دارالعلوم پہنچنے کی لگن تیز سے تیز تر۔ اس کے علاوہ میرا یہ خیال تھا کہ وہاں میرے علمی ذوق کی تشنگی کا سامانِ سیرابی بڑے پیمانے پر مہیا ہوسکے گا اور بحث و مباحثہ کی صلاحیتوں اور قوتوں کے اظہار کے لیے مجھے وسیع میدان ملے گا، تعلیم و تدریس کے اصول و قواعد سیکھنے اور انھیں برتنے کا سلیقہ آئے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملت کے قابل فخر رہنماؤں اور ان کی عظیم شخصیتوں کا قرب میرے لیے اخلاقی و روحانی فیض کا باعث بنے گا۔

مجھے اندیشہ تو یہ تھا کہ میرے خاندان والے میرے خیال کی تائید نہ کرتے ہوئے میرے اس باغیانہ اقدام کو ناپسند کریں گے اور میرا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا مگر برخلاف اس کے جب میری خواہش اور میرے فیصلے کا خیر مقدم کیا گیا اور بخوشی مجھے دارالعلوم جانے کی اجازت دے دی گئی تو میری مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھتے ہی میرا خیال یقین میں بدل گیا۔ تصور ایک جیتی جاگتی حقیقت بن گیا۔ مجھے اپنے فیصلے پر خود ہی رشک آنے لگا۔ مظاہر العلوم کے مقابلے میں یہاں اساتذہ اور طلبہ کی تعداد دوگنی سے بھی زیادہ تھی۔ روح پرور ماحول، دینی و مذہبی افکار سے سرشار

فضا، علم کے شیدائی کا اجتماع، گویا مجھے پکار پکار کر دعوتِ فکر وعمل دے رہا تھا۔ میں نے یہاں اکابرِ ملت اور اساتذۂ کرام کی شفقت ومحبت، محنت ولگن اور استغنا، وتوکل کے وہ نمونے دیکھے جنھیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ طلبہ کو یہاں تعمیر سیرت اور کردار سازی کے مواقع دوسرے اداروں کی بہ نسبت اس لیے زیادہ ملتے ہیں کہ یہاں کے اساتذہ اپنے مثالی کردار، بلند اخلاق اور پاکیزگیٔ افکار کے گہرے نقوش ان پر ثبت کرتے ہیں۔ کتابوں سے کہیں زیادہ اساتذہ کا حسنِ عمل اور بے غرضانہ خلوص طلبہ کی شخصیتوں اور ان کے اذہان کے لیے موثر ثابت ہوتا ہے۔ میں اِس سلسلے میں اپنے چند مشاہدات وتجربات پیش کرنا چاہوں گا۔ جہاں تک اساتذہ کی شفقت ومحبت کا تعلق ہے تو حقیقتاً وہ اپنے طلبہ سے اِسی طرح پیش آتے تھے جس طرح والدین آتے ہیں۔ اقامت گاہوں میں پابندی سے تشریف لاتے۔ طلبہ کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے۔ ہر طرح سے ان کی خیر خبر لیتے۔ اگر کوئی طالب علم مالی تنگی کی وجہ سے ہوسٹل میں قیام نہیں کرسکتا تھا تو اس کی دلجوئی کرتے، اس کا حوصلہ بڑھاتے اور اس کو ہر ممکن مدد دیتے۔ خود میرے قریب کے کمرے میں ایک نوارد طالب علم کا واقعہ ہے کہ داخلے کے امتحان میں اس کو اتنے اچھے نمبر نہ مل سکے کہ وظیفے کی اتنی رقم پانے کا مستحق ہوتا جس سے وہ اپنے اخراجات پورے کرسکتا اس کو تو تحصیل علم کا شوق کشاں کشاں دیوبند لے آیا تھا ورنہ اس کی معاشی حالت اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ وظیفہ نہ ملنے کی صورت میں اس نے مجبوراً اپنے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اساتذہ تک اس کی خبر کس طرح پہنچی۔ بہرحال چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تین استاد باری باری اس لڑکے کے پاس آئے اور صورتِ حال معلوم کی۔ جب ان کو لڑکے کے فیصلے کا علم ہوا تو انھوں نے پوری ذمے داری کے ساتھ اس کے سارے تعلیمی مصارف کی کفالت اپنے سر لے لی۔ اس کو تسلی وتشفی دی اور ہوسٹل میں اس کے قیام کا انتظام کردیا۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے بڑی مسرت ہے کہ وہی طالب علم آج پاکستان کے ایک بڑے دینی مدرسے میں قال اللہ قال الرسول کی صدا بلند کیے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ایسی ہیں جو استادان دارالعلوم کے پرخلوص رویے، ان کی بے پناہ ہمدردی اور قومی وملی درد سے بھرپور جذبات کی آئینہ دار ہیں۔

یوں تو دارالعلوم میں رسمی طور پر صرف چھے گھنٹے تعلیم حاصل ہوتی ہے مگر عملاً بعد فجر سے گیارہ بجے رات تک اساتذہ وطلبہ درس وتدریس میں مشغول رہتے ہیں۔ کوئی بھی استاذ بغیر مطالعہ کیے ہوئے درسگاہ میں پڑھانے نہیں آتا۔ شیخ الادب والفقہ استاذی مولانا اعزاز علی نوراللہ مرقدہ فجر کی نماز کے بعد ''ہدایہ آخرین'' کا درس دینے کے لیے درجے میں آجاتے اور ڈھائی گھنٹے اپنی بارعب

آواز میں اس دلچسپی اور محنت سے پڑھاتے کہ طلبہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اِس میں محو ہوجاتے۔ حضرت مولانا یہ کتاب کم از کم بیس بار پڑھا چکے تھے مگر اس کے باوجود وہ بغیر مطالعہ کیے ہوئے کبھی نہ پڑھاتے۔ اگر کتاب کے حاشیے کو پڑھ کر کوئی طالب علم سوال کرتا تو جواب دینے کی بجائے اس سے یہ کہتے کہ ''مولوی صاحب آپ نے جہاں سے سوال کیا ہے وہیں اس کا جواب موجود ہے۔'' وہ ہمیشہ طلبہ سے علمی، سنجیدہ اور بلند سطح کے سوالات کرنے کی توقع رکھتے۔ دورانِ درس وہ ایسے طلبہ کی تلاش میں رہتے جو محنتی، مطالعے کے شوقین اور ضرورت مند ہوتے وہ ان کو یا تو اپنے مطالعے کے کمرے میں بلاتے یا خود ان کے کمروں میں جا کر بعد سلام کے ان کی خیریت معلوم کرتے اور سب سے چھپا کر حسب گنجایش امدادی رقم دینے کے بعد سلام کر کے چلے آتے۔ تحفہ اور ہدیہ قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے۔ میں نے اپنے ایک ساتھی سے یہ سنا کہ بڑی منت سماجت کے بعد اس نے حضرت مولانا کی خدمت میں ایک قیمتی رومال تحفہ پیش کیا جس کو انھوں نے بڑی مشکل سے قبول کیا۔ کسی غلطی کی بناء پر یہ طالب علم دارالعلوم کی طرف سے سزا کا مستحق قرار پایا گیا۔ پانچ مہینے بعد یہی طالب علم اپنے اسی معاملے میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اپنا مسئلہ رجوع کیا۔ حضرت مولانا کچھ جواب دینے کی بجائے اٹھے، الماری کھولی اور وہ تحفہ جو اسی طرح ابھی الماری میں محفوظ تھا، شکریے کے ساتھ واپس کیا اور فرمایا کہ ''میری طرف سے آپ اس کو استعمال کریں'' پھر کہا ''آپ قاعدے کے مطابق درخواست دیں جو جو مدد ممکن ہوگی میں اس کے لیے حاضر ہوں۔'' دارالعلوم کے قاعدے کے مطابق اس کی سزا معاف نہیں ہوسکتی تھی۔ صرف مہتمم کو اختیار خصوصی کی بنا پر اس سزا کی معافی کا حق تھا۔ حضرت مولانا نے اس کی عرضی پیش کرتے ہوئے مہتمم صاحب سے ہمدردی کی درخواست کی۔ اس طرح وہ طالب علم بری ہوگیا۔ پھر حضرت مولانا اس کے کمرے میں پہنچے اور پہلے اس سے اِس اذیت کے لیے معذرت چاہی جو ان کے سخت رویے سے اُسے پہنچی تھی۔ اس کے بعد اس کو بری ہونے کی خوشخبری سنائی۔

حکیم اسلام استاذ مکرم مولانا طیب صاحب کے انداز تدریس کو کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔ وہ شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا کرتے تھے حالانکہ ان کی زندگی مصروف ترین زندگی تھی۔ دارالعلوم کے اندر اور باہر کے بے شمار ایسے مسائل تھے جس کی وجہ سے ان کا وقت کبھی خالی نہ رہتا۔ مگر جب بھی مولانا دیوبند میں ہوتے اپنی گوناں گوں مصروفیتوں میں سے وقت نکال کر حجۃ اللہ البالغہ کا درس دینے مقررہ کمرے میں آتے اور انتہائی پرسکون طریقے سے عالمِ استغراق میں پڑھانا شروع کرتے۔ اِس وقت ان کے ذہن میں کوئی مسئلہ اور اُلجھن نہ ہوتی۔ ان کی تمام تر توجہ

درس پر مرکوز ہوتی۔ وہ علمی مسائل پر اس طرح بحث کرتے اور اس کو اس دلنشیں انداز میں سمجھاتے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہتا۔ مولانا کے حکیمانہ اور متکلمانہ اندازِ بیان، علوم میں ان کی گہری بصیرت اور ان کی بارعب و پرکشش شخصیت کے انمٹ نقوش ہمیشہ میرے ذہن میں رہیں گے۔

یہاں کے اساتذہ میں توکل اور استغنا کی جو کیفیت دیکھی اس سے ادارے سے ان کی وابستگی اور دینی و اخلاقی اقدار کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسرے اداروں میں اساتذہ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ آمدنی کے ذرائع تلاش کریں مگر یہاں کے اساتذہ اپنی قلیل تنخواہوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ادارے کی خدمت کو عین سعادت سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بڑی تنخواہوں کی پیشکش کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور اپنے عزیز ادارے سے وابستگی کو باعثِ فخر خیال کرتے ہیں۔ میں نے علی گڑھ کے بعض بااثر ذمہ داروں کی ایما سے وہاں سے استاد کو یہ لکھا کہ ان کی قابلیت واہلیت اور تجربے کے مطابق ایک اچھی آسامی خالی ہے۔ تقرر کی قوی امید ہے درخواست بھیج دیجئے میرے اس خط کے جواب میں ان صاحب نے درخواست کا مقررہ فارم واپس کر دیا اور لکھا ''الحمدللہ میں یہاں بہت مطمئن ہوں۔ اکابر کی خدمت کے مواقع میسر ہیں۔ دارالعلوم کی ملازمت میرے لیے صرف ایک ذریعہ معاش نہیں ہے بلکہ ایک سعادت ہے۔ میرے اکابر اور اساتذہ اگر مجھے وہاں کی خدمت کے لیے حکماً بھیجیں تو مجھے انکار کی مجال نہیں ورنہ میں اپنے دارالعلوم کو رہتی زندگی تک چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں۔ آپ کی توجہ اور مہربانی کا میں شکر گذار ہوں۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔''

استغنار کی ایسی کئی مثالیں مل جائیں گی جن کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد قوم میں سے ایسے افراد تیار کرنا تھا اور ہے جو ایک طرف دینی علوم کے ماہر اسلامی روح وجذبے سے سرشار شخصیت کے مالک اور اسلامی شعار کے جیتے جاگتے نمونے ہوں تو دوسری طرف قوم وملت کے بے لوث خادم اور بہی خواہ اور اس کے محافظ۔ دارالعلوم کی تاریخ ایسی ممتاز شخصیتوں سے مزین ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اعلار کلمۃ اللہ کے لیے وقف کر دیں اور جو اپنے علم وعمل، بلندی اخلاق وکردار اور مثالی کمالات وفضائل کی وجہ سے زندہ جاوید رہیں گی۔

دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے اساتذۂ گرامی کے فیضان ہی کی بدولت میرے افکار کو جلا اور میری زندگی کو صحیح منزل ملی ہے وہاں کی کیف آگیں یادیں اور روح پرور صحبتیں، وہاں کے شب و روز اور علمی مشاغل اور وہاں کے استادوں کی عنایتیں اور شفقتیں، زندگی کا وہ انمول سرمایہ ہیں جو میرے نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہیں۔

خواب کی حقیقت اور اس کے احکام

از: مفتی تنظیم عالم قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

انسان کبھی نیند کی حالت میں بہت سی ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو بیداری اور جاگنے کی حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ عرف عام میں اس کو خواب کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خلاصۃ التفاسیر میں ہے کہ خواب میں روح جسم سے نکل کر عالم علوی اور عالم سفلی میں سیر کرتی ہے جو جاگنے میں نہیں دیکھ سکتی وہ دیکھتی ہے۔ اسے حسِ روحانی کہنا چاہیے، حس جسمانی صرف حاضر پر حاوی ہوسکتی ہے اور حس روحانی حاضر وغائب دونوں کا ادراک واحساس کرتی ہے، اس لئے خواب میں ایسے احوال وکیفیات مشاہدہ میں آتی ہیں جن سے خود خواب دیکھنے والے کو بڑی حیرت ہوتی ہے، کبھی مسرت انگیز اور کبھی خوفناک تصویریں ذہن میں ابھرتی ہیں اور بیداری کے ساتھ ہی یہ تمام کہانی یکلخت مٹ جاتی ہے۔ قرآن کے متعدد مقامات میں مختلف نوعیّتوں سے خواب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور احادیث میں بھی رسول اکرم ﷺ نے اس کی قدرے تفصیل بیان فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواب کا وجود حق ہے۔ انبیاء کرام کے علاوہ دیگر افراد کا خواب اگرچہ حجت شرعی نہیں تاہم یہ فیضان الوہیت اور برکات نبوت سے ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اچھا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ اس سے مراد علم نبوت ہے یعنی رویاء صالحہ علم نبوت کے اجزاء اور حصوں میں سے ایک جزو حصہ ہے۔ (صحیح بخاری ومسلم) غور کیا جائے تو اس حدیث میں آپ ﷺ نے اچھے اور بہتر خواب کی فضیلت ومنقبت بیان فرمائی ہے اور اسے نبوت کا پرتو قرار دیا ہے۔

واضح رہے کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں: پہلی قسم نفس کا خیال ہے، یعنی انسان دن بھر جن امور میں مشغول رہتا ہے اور اس کے دل ودماغ پر جو باتیں چھائی رہتی ہیں وہی رات میں

بصورت خواب مشکّل ہوکر نظر آتی ہیں، مثلاً ایک شخص اپنے پیشہ وروزگار میں مصروف رہتا ہے اور اس کا ذہن وخیال ان ہی باتوں کی فکر اور ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے جو اس کے پیشہ وروزگار سے متعلق ہیں تو خواب میں اس کو وہی چیزیں نظر آتی ہیں، یا ایک شخص اپنے محبوب کے خیال میں مگن رہتا ہے اور اس کے ذہن پر ہر وقت اسی محبوب کا سایہ رہتا ہے تو اس کے خواب کی دنیا پر بھی وہی محبوب چھایا رہتا ہے۔ غرض کہ عالمِ بیداری میں جس شخص کے ذہن وخیال پر جو چیز زیادہ چھائی رہتی ہے، وہی اس کو خواب میں نظر آتی ہے۔ اس طرح کے خواب کا کوئی اعتبار نہیں۔

دوسری قسم ڈراؤنا خواب ہے، یہ خواب اصل میں شیطانی اثرات کا پرتو ہوتا ہے۔ شیطان چوں کہ ازل سے بنی آدم کا دشمن ہے اور وہ جس طرح عالم بیداری میں انسان کو گمراہ کرنے اور پریشان کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح نیند کی حالت میں بھی وہ انسان کو چین نہیں لینے دیتا۔ چنانچہ وہ انسان کو خواب میں پریشان کرنے اور ڈرانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے۔ کبھی تو وہ کسی ڈراؤنی شکل وصورت میں نظر آتا ہے جس سے خواب دیکھنے والا انتہائی خوفزدہ ہوجاتا ہے، کبھی اس طرح کے خواب دکھلاتا ہے جس میں سونے والے کو اپنی زندگی جاتی نظر آتی ہے جیسے وہ دیکھتا ہے کہ میرا سر قلم ہوگیا وغیرہ وغیرہ اسی طرح خواب میں احتلام کا ہونا کہ جو موجب غسل ہوتا ہے اور بسا اوقات اس کی وجہ سے نماز فوت یا قضا ہوجاتی ہے اسی شیطانی اثرات کا کرشمہ ہوتا ہے۔ پہلی قسم کی طرح یہ بھی بے اعتبار اور ناقابل تعبیر ہوتی ہے۔ اسی طرح کے ڈراؤنے اور برے خواب سے حفاظت کے لیے حدیث میں اس دعا کی ہدایت دی گئی ہے۔

اَعُوْذُبِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِہٖ وَعَذَابِہٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِہٖ وَمِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنَ وَاَنْ یَّحْضُرُوْنَ. (ابوداؤد وترمذی) ''میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کے کلمات تامات کے ذریعہ خود اس کے غضب اور عذاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور شیطانی وساوس واثرات سے اور اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں اور مجھے ستائیں''۔

خواب کی تیسری قسم وہ ہے جس کو منجانب اللہ بشارت کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کے خواب میں بشارت دیتا ہے اور اس کے قلب کے آئینہ میں بطورِ اشارات وعلامات ان چیزوں کو مشکل کرکے دکھاتا ہے جو آئندہ وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہے یا جن کا تعلق مؤمن کی روحانی وقلبی بالیدگی وطمانیت سے ہوتا ہے وہ بندہ خوش ہو اور طلب حق میں تروتازگی محسوس کرے، نیز حق تعالیٰ سے حسن اعتقاد اور امید آوری رکھے، خواب کی یہی وہ قسم ہے

جو لائق اعتبار اور قابل تعبیر ہے اور جس کی فضیلت وتعریف حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ (مظاہر حق جدید)

اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت اور خوشخبری ہوتی ہے کہ وہ بندہ خوش ہو اور اس کا وہ خواب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے حسن سلوک اور امید آوری کا باعث اور شکر خداوندی میں اضافہ کا موجب بنے اور برا خواب شیطانی اثرات کا عکاس ہوتا ہے یعنی برے خواب سے انسان فطری طور پر پریشان اور غمگین ہوتا ہے جس سے شیطان بڑا خوش ہوتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے ہدایت دی ہے کہ جو شخص برا اور ناپسندیدہ خواب دیکھے اس کو چاہیے کہ بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور تین بار شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے اور اپنی اس کروٹ کو تبدیل کردے جس پر وہ خواب دیکھنے کے وقت سو رہا تھا۔ (مشکوٰۃ:۳۹۴)

دوسری حدیث میں ہے کہ جب کوئی اس طرح کا خواب دیکھے تو اس طرف توجہ نہ دے اور نہ اس کو کسی دشمن یا دوست کے پاس بیان کرے، اللہ کی پناہ مانگنے اور تین بار تھتکارنے سے انشاء اللہ وہ اس برے خواب کے مضر اثرات سے محفوظ رہے گا۔ ایسا خواب کسی دشمن یا دوست کے سامنے بیان نہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ سننے والا خواب کی ظاہری حالت کے پیش نظر جب خراب تعبیر دے گا تو اس کی وجہ سے فاسد وہم میں مبتلا ہونا لازم آئے گا۔ دل ودماغ میں مختلف قسم کے اندیشے، وسوسے اور مختلف اوہام وخیالات پیدا ہوں گے جن سے وہ شخص پریشان ہوگا اور خواہ مخواہ اس کا سکون وچین متاثر ہوگا، اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ سننے والے شخص نے جس خراب تعبیر کی نشاندہی کی ہے وہ واقع ہوجائے۔ اس لیے کہ خواب کے وقوع پذیر ہونے میں خواب کو ایک خاص تاثیر حاصل ہے کہ خواب سننے والا جو تعبیر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ویسا ہی وقوع پذیر ہوجاتا ہے، چنانچہ ابورزین عقیلیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وھی علی رجل طائر مالم یحدث بھا فاذا حدث بھا وقعت (مشکوٰۃ:۳۹۶) ''خواب کو جب تک بیان نہ کیا جائے وہ پرندہ کے پاؤں پر ہوتا ہے اور جب اس کو کسی کے سامنے بیان کردیا جاتا ہے تو وہ واقع ہوجاتا ہے''... علی رجل طائر یعنی پرندہ کے پاؤں پر ہونا دراصل عربی کا ایک محاورہ ہے جو اہل عرب کسی ایسے معاملہ اور کسی ایسی چیز کے بارے میں استعمال کرتے ہیں جن کو قرار وثبات نہ ہو، مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح پرندہ عام طور پر کسی ایک جگہ ٹھہرا نہیں رہتا بلکہ اڑتا اور حرکت کرتا رہتا ہے اور جو چیز اس کے پیروں پر ہوتی ہے وہ بھی کسی ایک جگہ قرار نہیں پاتی بلکہ ادنیٰ سی حرکت

سے گر پڑتی ہے۔ اسی طرح یہ معاملہ اور یہ چیز بھی کسی ایک جگہ پر قائم وثابت نہیں رہتی لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ خواب کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ جب تک اس کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جاتا اور اس کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے اس وقت تک اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور نہ وہ واقع ہوتا ہے لیکن جب اس کو کسی کے سامنے بیان کر دیا جاتا ہے اور جوں ہی اس کی تعبیر دی جاتی ہے وہ اسی تعبیر کے مطابق واقع ہوجاتا ہے۔ اس لیے کسی کے سامنے اس طرح کے خواب کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اچھے خواب میں اگر چہ ناخوشگوار باتوں کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تاہم اسے بھی کسی جاہل، دشمن اور نااہل کے پاس بیان نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ اس کے غلط تعبیر بتانے کے سبب خواب کا رخ بدل سکتا ہے، البتہ اہل علم، تعبیر خواب کے ماہر اور دانا دوستوں سے بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

برصغیر کے مایۂ ناز محدث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اچھے اور بہتر خواب کی درج ذیل ۹ صورتیں بیان کی ہیں:

(۱) نبی اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھنا۔

(۲) جنت یا جہنم کو خواب میں دیکھنا۔

(۳) نیک بندوں اور انبیائے کرام علیہم السلام کو خواب میں دیکھنا۔

(۴) مقاماتِ متبرکہ جیسے بیت اللہ کو خواب میں دیکھنا۔

(۵) آئندہ پیش آنے والے واقعات کو خواب میں دیکھنا، پھر وہ واقعہ ویسا ہی رونما ہو جیسا اس نے دیکھا ہے مثلاً دیکھا کہ ایک حاملہ کو لڑکا پیدا ہوا پھر واقعی لڑکا پیدا ہو۔

(۶) گذشتہ واقعات کو واقعی طور پر خواب میں دیکھنا مثلاً دیکھا کہ کسی کا انتقال ہوگیا پھر انتقال کی خبر آئی۔

(۷) کوئی ایسا خواب دیکھنا جو کوتاہی پر آگاہ کرے مثلاً خواب دیکھا کہ کتا اس کو کاٹ رہا ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ غصیلا ہے، اپنا غصہ کم کرے۔

(۸) انوار اور ستھرے کھانوں کو خواب میں دیکھنا مثلاً دودھ، شہد اور گھی کا پینا۔

(۹) ملائکہ کو خواب میں دیکھنا۔ (حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۲۵۳)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أصدق الرؤيا بالأسحار (ترمذی) یعنی رات کے آخری حصے کا خواب زیادہ سچا

ہوتا ہے کیونکہ پچھلا پہر عام طور پر دل ودماغ کے سکون کا وقت ہوتا ہے، اس وقت نہ صرف یہ کہ خاطر جمعی حاصل رہتی ہے بلکہ وہ نزول ملائکہ، سعادت اور قبولیت دعا کا بھی وقت ہے۔ اس لیے اس وقت کا دیکھا ہوا خواب زیادہ سچا ہوتا ہے تاہم کسی خواب کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ خواب سچا ہے اور اس کا وقوع یقینی ہے۔ اس لیے کہ اچھا خواب اللہ کی طرف سے محض ایک رہنمائی ہوتی ہے کوئی حجت شرعی نہیں۔ خواب میں دیکھی ہوئی چیز جب واقع ہوجائے تو اس کے متعلق یقین ہوجائے گا کہ خواب سچا تھا، لیکن یاد رہے کہ اگر رسول اکرم ﷺ کو کسی نے خواب میں دیکھا تو وہ خواب سچا اور صحیح ہوگا، اس میں جھوٹ یا دھوکہ کا کوئی شائبہ نہیں، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے درحقیقت مجھ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا۔ (مشکوٰۃ:۳۹۴)

غلط خواب کا تعلق شیطان سے ہوتا ہے یہ اسی کی کارستانی ہے کہ مختلف غلط اور جھوٹے خیالات واوہام دل ودماغ میں پیدا کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی مبارک تصویر وشباہت پر شیطان حاوی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جس نے بھی حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا درحقیقت اس نے آپ کا ہی مشاہدہ کیا ہے اور یہ خواب دیکھنے والے کے تقویٰ، بزرگی اور قربت الٰہی کی دلیل ہے کہ اس کے کسی عمل سے خوش ہوکر اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے نبی کا دیدار کرایا ہے۔ البتہ اہل تحقیق اور اصحاب نظر نے اس میں کلام کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنا کب معتبر ہوگا۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ ﷺ کا جو حلیہ اور صورت احادیث میں بیان کی گئی ہے اسی صورت کیساتھ اگر دیکھا جائے تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ گویا اس نے آپ ﷺ ہی کو دیکھا ہے۔ اسی وجہ سے منقول ہے کہ حضرت محمد بن سیرین جو تعبیر فن کے امام تھے، ان کے پاس اگر کوئی آنحضرت ﷺ کو دیکھنے سے متعلق اپنا خواب بیان کرتا تو آپ ان سے دیکھے ہوئے حلیہ اور شکل وصورت کے بارے میں سوال کرتے اگر وہ آنحضرت ﷺ کا حلیہ بیان نہ کرپاتا تو اس سے کہتے کہ بھاگ جاؤ تم نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں نہیں دیکھا ہے۔

اس بارے میں شارحِ مسلم حضرت امام نوویؒ کی رائے یہ ہے کہ جس شخص نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا اس نے بہرصورت آپ ﷺ کو دیکھا خواہ اس نے اس مخصوص صورت و حلیہ میں دیکھا ہو جو آپ ﷺ کے بارے میں منقول ہے یا کسی اور شکل وشباہت میں دیکھا ہو کیوں کہ شکل وشباہت کا مختلف ہونا ذات کے مختلف ہونے کو ضروری قرار نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں یہ

نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ شکل وشباہت میں اختلاف وتفاوت کا تعلق خواب دیکھنے والے کے ایمان کے کمال ونقصان سے بھی ہوسکتا ہے یعنی جس شخص نے خواب میں آنحضرت ﷺ کو اچھی شکل وصورت میں دیکھا۔ یہ اس کے ایمان کامل اور عقیدے کے صالح ہونے کی علامت قرار پائے گا اور جس شخص نے اس کے برخلاف دیکھا یہ اس کے ایمان کی کمزوری اور عقیدے کے فساد کی علامت قرار پائے گی۔ اسی طرح ایک شخص نے آپ ﷺ کو بوڑھا دیکھا، ایک شخص نے جوان دیکھا، ایک شخص نے رضامند دیکھا، ایک شخص نے خفگی کے عالم میں دیکھا، ایک شخص نے روتے ہوئے دیکھا، ایک شخص نے شاد وخوش دیکھا اور ایک شخص نے ناخوش دیکھا تو یہ ساری حالتیں خواب دیکھنے والے کے ایمانی احوال کے فرق وتفاوت پر مبنی ہوں گی کہ جو شخص جس درجہ کے ایمان کا حامل ہوگا وہ آپ ﷺ کو اسی درجہ کی مثالی صورت میں دیکھے گا۔ اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھنا گویا اپنے احوال ایمانی کو پہچاننے کا معیار ہے۔ لہٰذا یہ چیز سالکین طریقت کے لیے ایک مفید ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے باطن کی حالت کو پہچان کر اس کی اصلاح کریں۔ (مظاہر حق جدید ۵/ ۳۱۷)

اس حدیث کے تحت اہل تحقیق نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس شخص پر وہ احکام عائد ہوں جو واقعتاً آنحضرت ﷺ کے دیدار وصحبت کی صورت میں ہوتے ہیں یعنی نہ تو ایسے شخص کو صحابی کہا جائے گا اور نہ اس چیز پر عمل کرنا اس کے لیے ضروری ہوگا جس کو اس نے اپنے خواب میں آنحضرت ﷺ سے سنا ہوگا۔ بہرحال اس انسان کی خوش نصیبی کا کیا کہنا جس نے سرکار دوعالم ﷺ کا کم سے کم خواب میں ہی دیدار کیا ہو۔ یہ اس کے لیے عظیم نعمت اور بڑی سعادت مندی کی بات ہے۔ اسی طرح دوسرے اچھے اور بہتر خواب کا دیکھنا بھی خوش آئند بات ہے اسے اللہ کی طرف سے اچھی خبر سمجھنا چاہیے جو انسان کے دل ودماغ کو فطری طور پر خوش کردیتی ہے۔

❁ ❁ ❁

قطع حیات بہ جذبۂ رحم (Euthanasia) کی شرعی حیثیت

(۳)

از: مفتی محمد شمیم اختر قاسمی
ریسرچ اسکالر: شعبۂ دینیات (سنی)
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قبل اس کے کہ ہم یوتھینیز یا کے عمل کو بروئے کار لانے کی حلت وحرمت کا فیصلہ کریں ضروری ہے کہ اس سلسلے میں ہونے والے ایک مباحثہ کی تفصیل بیان کردیں تاکہ نفس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھا جاسکے اور اس طرح شریعت کے احکام آشکارا ہوجائیں۔ یہ وہ مباحثہ ہے جو قاضی شریعت مولانا مجاہدالاسلام کی موجودگی میں ہوا تھا اور جس پر قاضی صاحب نے اپنا عالمانہ تبصرہ بھی فرمایا تھا؛ مگر چوں کہ اس وقت یہ مسئلہ نیا تھا اور اس سے لوگ کم واقف تھے کہ اس عمل کو بروئے کار لانے میں کیا نقصان اور فوائد ہوسکتے ہیں، اس لیے اس پر کوئی حکم لگانے کے بجائے موخر کردیا اور اسے فقہ اکیڈمی کے سالانہ سیمینار کا موضوع بحث بنانے کی کوشش کی گئی جس پر کافی عرصہ بعد عمل کیا گیا اور پھر اکیڈمی نے متفقہ طور پر اپنا فیصلہ صادر کیا۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ مذکورہ مباحثہ میں ۸/ممتاز علمائے ہند نے حصہ لیا تھا اور اپنے قیمتی آراء وخیالات سے نواز کر علمائے عظام اور مفتیان کرام کو دعوت ملاحظہ پیش کیا تھا کہ اس صورت میں اسلام کے موقف کو سمجھنے میں غلطی اور تاخیر کی گئی تو بھیانک نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ تو نیچے ان آٹھوں علمائے کرام اور قاضی شریعت کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

''مولانا عبدالعزیز صاحب سابق مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور فرماتے ہیں:

ایکٹیو یوتھینیز یا کی وہ صورت جس میں ڈاکٹروں کو مریضوں کی جان لینے کے لئے کوئی مثبت عمل کرنا پڑتا ہے، مثلاً: کوئی تیز انجکشن، یا دوا استعمال کرادی جائے، جس سے مریض کی سانس بند

ہوجائے، یہ جائز نہیں ہے، یہ قتل نفس ہے جس کی قرآن واحادیث میں ممانعت وارد ہے:

"وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ إِلَّا بِالْحَقِّ" (سورۂ انعام:۱۵۱)

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

"لا یحل دم امرئ مسلم یشهد أن لا اله الا اللّٰه وأنی رسول اللّٰه إلا باحدی ثلث: النفس بالنفس، والثیب الزانی، والمارق لدینه، التارك للجماعة" (متفق علیہ)

(کسی مسلمان کی جان لینا جو اللہ کی توحید اور حضور ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتا ہو درست نہیں، الا یہ کہ وہ قاتل ہو، یا شادی شدہ زانی ہو، یا دین سے نکل جانے والا اور جماعت کو چھوڑ دینے والا ہو)

اگر کسی مریض کی سانس کسی مصنوعی آلہ کے ذریعہ سے چلائی جارہی ہو اگر اس آلہ کو ہٹادیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ یہ ترک تدبیر ہے۔

پیسیو یوتھینیز یا کی دونوں صورتوں میں یہی ترک علاج ہے، ایسے مریضوں کا اگر علاج نہ کیا جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے، اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

مولانا احمد بیمات، دارالعلوم فلاح دارین فرماتے ہیں:

اطباء اور ڈاکٹروں کی اصطلاح میں ایسے مریض، جن کا علاج ممکن نہیں، ان کی صحت کی امید نہیں، ان کے لئے ایسی دوا تجویز کرنا، جس سے مریض جلدی سے مرجائے، ایسا مثبت علاج، دوا خود مریض استعمال کرے یا ڈاکٹر جائز نہیں، حرام ہے۔

اگر ڈاکٹر، طبیب ایسا علاج کرے گا تو قتل نفس کا گناہ اور مریض کرے گا تو خودکشی کا ارتکاب ہوگا، اسلئے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں تمام فقہاء نے لکھا ہے کہ:

"یکره تمنی الموت لغضب، أو ضیق عیش، وفی صحیح مسلم: لا یتمنین أحدکم الموت لضرّ نزل به" (شامی ۵/۲۷۰)۔

(غصہ یا تنگدستی کے باعث موت کی تمنا کرنا مکروہ ہے، اور صحیح مسلم میں ہے کہ تم میں سے کوئی موت کی تمنا کسی تکلیف کی وجہ سے ہرگز نہ کرے)

فرمان رسول اللہ ﷺ سے معلوم ہوا کہ کسی ضرر (پریشانی) اور تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ ''مرقاۃ'' میں لکھا ہے کہ: ''حیات وزندگی اللہ کا امر اور حکم ہے، اور موت کی تمنا حکم الٰہی سے فرار ہے، حکم الٰہی سے عدم رضا ہے، لہٰذا جائز نہیں۔'' (حاشیہ مشکوٰۃ ۱/۱۳۹)

مومن کی حالت ''سلب ارادہ'' اور مولی خالق جن احوال میں رکھے، اس سے راضی رہنا

ہے، لہٰذا طبیب کا فعل قتل نفس ہوگا، اور مریض کا فعل خودکشی کا ارتکاب ہوگا، لہٰذا اس باب میں جو روایات وعید وعذاب کی وارد ہوئی ہیں، ان کا مصداق ہوگا، أعاذنا اللّٰہ منہ.

لیکن ڈاکٹر کی دوا یا طبیب کا علاج صحت کے ارادہ سے تھا، مگر اس کا الٹا اثر ہوا، تو ان وعیدوں کا مستحق نہیں ہوگا، اس لئے کہ مسلم شریف میں موجود ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''سابق زمانہ میں ایک انسان تھا اس کو زخم نکلا، صبر نہیں کیا اور اپنے تیر سے زخمی کرلیا تاکہ مرجائے، اور اس طرح اس کا انتقال ہوگیا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں نے اس پر جنت حرام کردیا ہے'' (مسلم شریف ۱/۷۲)۔

علامہ نوویؒ نے تحریر فرمایا:

"استعجالا للموت أو لغير مصلحة، فإنه لو كان على طريق المداواة التي يغلب الظن على نفعها، لم يكن حراما" شرح مسلم للنووی ۱/۷۳)

''یعنی کوئی ایسا عمل جس کا مقصد موت کو جلدی بلانا ہو، یا اس میں کوئی مصلحت نہ ہو (درست نہیں) ہاں اگر بطریق علاج معالجہ جس میں غالب امید نفع کی ہو تو حرام نہیں ہوگا۔''

لہٰذا طبیب کا ایسا علاج، جس میں مریض جلد از دم توڑ دے، حرام ہے، اس لئے کہ مریض کو حکم الٰہی سے حالت مرض میں صبر کرنا چاہئے، حکم مولی سے راضی رہنا چاہئے، اس لئے موت تو کیا موت کی تمنا بھی دنیاوی تکلیف کی وجہ سے حرام ہے۔

سوال مذکور دوسری صورت (Passive Euthanasia) یعنی لاعلاج مریضوں کا علاج نہ کرنا، ترک علاج جائز ہے، اور یہ جائز ہو، یا ناجائز، لاعلاج مریضوں کے لئے عدم استعمال کی گنجائش ہے، ترک دوا سے مریض یا اولیاء مریض گنہگار نہیں ہوں گے، لیکن اس باب میں ترجیح مریض کی ہوگی، عالمگیری میں ہے:

''پس اگر کوئی شخص بیمار ہوجائے یا آشوب چشم کا شکار ہوجائے، پس علاج نہیں کرائے یہاں تک کہ مرجائے تو گنہگار نہیں ہوگا، ایسے ہی ''ملتقط'' میں ہے، اور اگر کسی آدمی کو دست آنے لگے یا آنکھ آجائے پس اس نے علاج نہیں کرایا، یہاں تک کہ وہ کمزور ہوکر مرگیا تو اس پر گناہ نہیں۔'' (عالمگیری ۶/۲۳۶)۔

''شامی'' میں ہے:

''علاج معالجہ اگرچہ حلال دواؤں کے ذریعہ ہو، اگر چھوڑ دیا اور مرگیا تو گنہگار نہیں ہوگا،

جیسا کہ لوگوں نے اس کی تصریح کی ہے، اس لئے کہ دواؤں سے شفا (یقینی نہیں) بلکہ ظنی ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے‘‘ (ردالمحتار ۵/۳۴۳)۔

’’مجمع الانہر‘‘ میں ہے:

’’بخلاف اس شخص کے جو دوا کھانے سے باز رہا یہاں تک کہ مرگیا (وہ گنہگار نہیں ہوگا) اس لئے کہ اس کا یقین نہیں ہے کہ اس کو شفا مل ہی جائے گی۔‘‘ (مجمع الانہر ۲/۵۲۵)۔

اور ’’ملتقی الابحر‘‘ میں ہے:

’’پس ایسا شخص (جو دوا نہ کھائے) گنہگار نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس کا یقین نہیں ہے کہ یہ دوا اس کو شفا دے گی، اور شاید وہ بغیر علاج ہی تندرست ہوجائے، جیسا کہ ’’اختیار‘‘ میں ہے‘‘ (ملتقی الابحر ۲/۵۲۵)۔

فقہاء کے ان اقوال سے معلوم ہوا کہ دواؤں سے بیماری کی شفا یقینی نہیں ہے، ظنی یا وہمی ہے، لہٰذا ان علاج ومعالجات کو چھوڑنا جائز ہے، شافی حقیقی اللہ ہے، اگر دوا کو مؤثر سمجھتا ہے تو کفر ہے، طبیب اور ڈاکٹر کو شافی سمجھے گا تو ایمان سے نکل جائے گا، دوا، علاج، معالجہ اسباب کے درجہ میں ہیں، لہٰذا مؤثر حقیقی، شافی حقیقی پر بھروسہ رکھ کر علاج چھوڑ دے تو جائز ہے، لیکن اس عدم علاج ومعالجہ کو نہ سمجھے کہ وہ اس سے جلدی مرجائے گا، جلدی موت آجائے گی، موت مقررہ وقت پر ہی آنے والی ہے، علاج کرے یا نہیں۔

"الاشتغال بالتداوی، لا بأس به إذا اعتقد أن الشافی هو اللّٰه تعالیٰ، وأنه جعل الدواء سببا، أما إیّا أعتقد أن الشافی هو الدواء فلا، کذا فی السراجیة" (عالمگیری ۶/۲۳۶)

’’دوا علاج کرانے میں کوئی حرج نہیں، اگر اعتقاد یہ ہو کہ شفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور اسی نے دوا کو شفا کا ذریعہ بنایا ہے، لیکن اگر کوئی شخص دوا ہی کو شفا دینے والا مانے تو پھر یہ صحیح نہیں ہوگا، ایسا ہی سراجیہ میں ہے۔‘‘

عالمگیری میں ایک جزئیہ لکھا ہے کہ ماہر طبیبوں کی رائے ہے کہ مریض لاعلاج ہے، زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں ہے تو علاج کو چھوڑ دے۔

"وإن قیل: لا ینجو أصلا. لا یتداوی بل یترك، کذا فی الظهیریة" (عالمگیری ۶/۲۳۹)

مولانا عبدالجلیل صاحب قاسمی، قاضی شریعت بتیا، مغربی چمپارن لکھتے ہیں:

دوا کے استعمال کے ذریعہ زندگی کو ختم کرنا، اگر مریض خود کرے تو خودکشی ہے اور اگر دوسرا

کرے تو قتل نفس ہے، اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اس غرض سے علاج نہ کرنا کہ مریض کی زندگی جلد ختم ہو، جائز ہوگا، اس لئے کہ علاج فرض نہیں ہے کہ جس کا نہ کرانا گناہ ہو، خاص کر ایسی حالت میں جب کہ صحت کی امید غالب نہ ہو۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کی رائے مندرجہ ذیل ہے:

ان دونوں تدبیروں کی غرض، مریض کو یا اس کے متعلقین کو تکلیفوں سے نجات دلانا، یا ان کی تکالیف کو کم کرنا مذکور ہے۔... روایت جمع کرنے کا اس وقت محل نہیں ہے، احادیث سے رجوع کرکے اسکی تفصیل معلوم کی جاسکتی ہے کہ مریض کو جو تکالیف غیر اختیاریہ پہنچتی ہیں، اور وہ اس پر صبر کرتا ہے، اور اپنے کو خدا کے سپرد کرتا ہے، تو اسکے لئے یہ تکالیف اس کے گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں، اور آخرت میں درجات بلند ہوتے ہیں، اور اچھی زندگی نصیب ہوتی ہے، حتیٰ کہ مرنے والا معصوم یا نابالغ بچہ ہوتا ہے تو اس کی ان تکالیف سے اس کے والدین اور متعلقین و تیمارداروں کو جب وہ اس پر صبر کرتے ہیں اور کلفت برداشت کرکے تفویض الی اللہ کرتے ہیں تو ان کے گناہ بھی جھڑتے ہیں اور آخرت سنورتی ہے۔

بالکل یہی حال بالغین وغیر معصومین کے متعلقین اور تیمارداروں کا بھی ہوتا ہے کہ ان کی تکالیف پر صبر کرنے اور ان کی صحت و بھلائی کی تدبیر میں مشغول رہنے والے کے لئے یہ تکالیف کفارۂ ذنوب اور آخرت میں بلندی درجات کا ذریعہ بنتی ہیں، اور پھر ہمیشہ ہمیشہ ابدالآباد تک راحت اور چین ملتا ہے۔

اسلئے ان مذکورہ دونوں تدبیروں میں سے کسی تدبیر کا حکم، یا اجازت شرعاً ہرگز نہ ہوگی، البتہ دونوں تدبیروں کے حکم میں فرق یہ ہوگا کہ: ۱- میں (یعنی غیر طبعی موت دوا وغیرہ کے ذریعہ طاری کرنے میں) تو ایسا کرنے والے پر قتل کا گناہ اور وبال پڑے گا اور بسا اوقات شرعاً دیت یا ضمان وغیرہ بھی لازم آئے گا، اور ۲- میں یہ حکم (قتل کا گناہ) تو نہ ہوگا، لیکن ترک تدبیر اور صحت کے لئے ترک سعی، فعل مذموم وقبیح اور منشا شرع وشارع کے خلاف ضرور ہوگا، اور اگر سستی یا لاپرواہی سے ایسا کیا گیا تو اس پر مواخذہ بھی ضرور ہوگا۔

حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ رقم کرتے ہیں:

ڈاکٹروں کا مریض کو موت تک پہنچانے کے لئے کوئی مثبت عمل کرنا، یعنی کوئی ایسی مہلک دوا دینا یا تدبیر کرنا، جس سے عادتاً موت واقع ہوجاتی ہو، شریعت اسلامیہ کی رو سے قطعاً حرام ہے، کیونکہ جب تک انسان میں جان رہتی ہے، وہ نفس محترم ہے، اور کسی بھی ''نفس محترم'' کو ہلاک

کرنے کا ذریعہ بننا نہ صرف یہ کہ "وَلا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ" (سورہ انعام:۱۵۱) نص قرآنی سے حرام ہے، بلکہ ایسا کرنے والا بعض شکلوں میں خون بہا، اور بعض میں قصاص کا مستوجب شرعاً ہوگا، رہا یہ احتمال کی یہ مریض صحت یاب نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے اسے موت تک پہنچانا راحت دینا ہے، یہ شرعاً بے وزن ہے، کیونکہ حد مایوسی تک مریض کا پہنچنا اور اس کے بعد موت کا آنا زیادہ سے زیادہ تخمینی اور ظنی بات ہے، اور اس مریض کا اس وقت موجود وزندہ ہونا یقینی ہے، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ بسا اوقات ایسے مریض جن کی زندگی سے مایوسی ہوچکی تھی، اور ڈاکٹروں نے بھی لاعلاج قرار دے دیا تھا، وہ صحت یاب ہوگئے، البتہ وہ آلہ ہٹالینا یا دوا نہ دینا یقینی ذریعہ ہلاکت نہیں ہے (اس لئے کہ یہ سب تدابیر ظنی ہیں) اس وجہ سے (اس طریقہ سے اگر مریض کو موت ہوجاتی ہے) تو یہ عمل ''اہلاک'' نہیں کہلائے گا، بلکہ اسے علاج ومعالجہ کا ترک کہنا صحیح ہوگا، جو اصلاً حرام نہیں ہے، جیسا کہ کتب معتبرہ فقہیہ ''عالمگیری'' وغیرہ میں ہے:

"الأسباب المزيلة للضرر تنقسم إلى مظنون كالفصد و سائر أبواب الطب و تركه ليس محظورا" (عالمگیری کتاب الکراہیۃ باب الثامن عشر)

(وہ سبب جس کے استعمال سے ضرر کے دور ہوجانے کا یقین نہیں ہو بلکہ گمان ہو، جیسے فصد اور دوسری طبی تراکیب، اس طرح کہ اسباب کو چھوڑ دینا ممنوع نہیں ہے)

اس کا جواب بھی مذکورہ بالا جواب میں آگیا کہ ترک علاج اصلاً حرام نہیں ہے، البتہ نیت ''اہلاک'' سے ترک علاج (إنما الاعمال بالنيات) کے قاعدہ سے معصیت بن جائے گا، مگر حقیقی اہلاک سے کم درجہ کی معصیت۔ شامی (۵۱۲/۵) میں ہے:

"بخلاف من امتنع عن التداوي حتى مات (يعنى لايكون عاصيًا)"

(بخلاف اس شخص کے جو دوا علاج سے باز رہا، یہاں تک کہ مرگیا (یعنی وہ گنہگار نہیں ہوگا)

مولانا زبیر احمد قاسمی، ناظم مدرسہ اشرف العلوم کنہواں لکھتے ہیں:

اسلامی اصول وعقائد کے مطابق تمام ذی روح کی حیات وموت کا ایک دن متعین ہے، قرآن کہتا ہے: "وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَى حِيْنٍ" (سورہ بقرہ:۳۶) دوسری جگہ قرآن نے یوں تصریح کی ہے: "فَإِذا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ" (سورۂ اعراف:۳۴) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں ایک معینہ مدت تک رہنا ہے، اور جب اس کی موت کا وقت آئے گا تو بلا کسی تقدیم وتاخیر کے وہ اس دنیا سے کوچ کرکے

رہے گا، پھر کوئی طاقت اسے اس دھرتی پر زندہ رہنے کا حق نہیں دے سکتی...اس کے ساتھ ہی قرآن کا حکم ہے: "ولَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إلى التَّهْلُكَةِ" (سورۂ بقرہ:۱۹۵) یعنی کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو معرضِ ہلاکت میں ڈالے اور دیدہ ودانستہ کوئی ایسا اقدام کرے جو اس کی ہلاکت وبربادی کا سبب بن جائے، اسی طرح دوسروں کو ناحق قتل کرنا بھی شرعاً ممنوع ہے، قرآن میں صراحت ہے: "وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ" (سورۂ انعام:۱۵۱) دوسری جگہ قرآن کہتا ہے: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا" (سورۂ مائدہ:۳۲) حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے: "قال: لو أن أهل السماء والأرض اشتركوا في دم مومن لأكبتهم الله في النار" (رواہ الترمذی، مشکوۃ ص۲۲۰، ترجمہ: اگر آسمان وزمین کے سارے ہی لوگ کسی ایک مومن شخص کے قتل میں شریک ہوں تو اللہ ان سب کو جہنم میں ڈالے گا)

ساتھ ہی ساتھ احادیث میں کھلی ہدایت موجود ہے کہ کسی کو دنیاوی مصائب وشدائد سے تنگ آکر موت کی تمنا کرنا بھی جائز نہیں۔ "قال النبي ﷺ لا يتمنين أحدكم الموت من ضرّ أصابه" (بخاری بہامش فتح الباری ۱/۱۰۷)

دوسری روایت میں آتا ہے کہ: ایک زخمی شخص نے تکلیف سے تنگ آکر خودکشی کا اقدام کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بادرني عبدي لنفسه فحرمت عليه الجنة" (مشکوۃ:۳۳۰)۔اس کے علاوہ اسلامی عقیدہ کے مطابق اس دنیا کی تمام مصیبتیں اور تکالیف محض وقتی اور ظاہری ہیں، ورنہ درحقیقت انسانوں کے حق میں یہ ساری مصیبتیں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نوازشوں کا ہی ایک دوسرا روپ ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ما يصيب المسلم من نصب ولا وصب ولاهم ولاحزن ولا اذى ولا غم حتى الشوكة يشاكها إلا كفّر الله بها من خطاياه" (بخاری علی ہامش فتح الباری ۱۰/۱۹۔ یعنی مومن کو کوئی بھی غم، تکلیف، مصیبت، ایذا اور دکھ پہنچے یہاں تک کہ کانٹا چبھ جائے تو اللہ تعالیٰ ان تکلیفوں کو اس کے لئے گناہوں کا کفارہ بنادیتے ہیں)

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لا يتمنى أحدكم الموت إما محسنا فلعله أن يزداد وإما مسيئا فلعله أن يستعتب" (بخاری علی ہامش فتح الباری ۱۰/۱۱۰)

ان نصوص کی روشنی میں پہلے مسئلہ "یوتھینیزیا" سے متعلقہ سوالات کے جواب یہ ہوئے:

اسلام عمداً کسی ایسی تدبیر اور مثبت عمل کی ہرگز اجازت نہیں دیتا جو کسی کی موت کا سبب بن جائے کسی کو ناحق مارنے کی جو بھی صورتیں ہوسکتی ہیں وہ شرعاً انتہائی مذموم اور ناجائز ہوں گی، ان کا

مرتکب مجرم وگنہگار ہوگا۔

کسی معذور مریض کی تمام تر تکلیفیں چونکہ خود مریض اور معذور کے حق میں نتیجتاً اور مآلاً رحمت خداوندی اور حقیقتاً باعث خیر ہیں، اس لئے اسے موت کے قریب کرنے کی تدبیریں حقیقتاً رحم وکرم نہیں، بلکہ جور وظلم ہی کہلائیں گی، اسی طرح مجبور مریض کی تیمارداری اور خبر گیری جوان کے اعزہ واقربار کا صرف اخلاقی فریضہ نہیں ہے بلکہ "الغرم بالغنم" کے تحت شرعی ذمہ داری بھی ہے، اس ذمہ داری کے نباہنے میں ان کو بھی جن مشکلات اور پریشانیوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ بھی "ما یصیب المسلم من نصب ولا وصب ولاهم ولا حزن (الحدیث)" کے تحت ان کے حق میں کفارۂ سیئات اور موجب اجر وثواب ہیں، اس لئے نہ تو مریض کی ذات پر ترس کھانے کے عنوان سے اور نہ اعزہ واقربار کو طویل تکلیفوں سے نجات دلانے کے نام پر ہی اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، کہ کوئی ایسا مثبت عمل اور ایجابی تدبیر اختیار کی جائے جس کے نتیجہ میں اس کی موت جلد از جلد آجائے، قرآن نے کھل کر کہا ہے: عَسٰی أَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی أَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ" (سورہ بقرہ ۲۱۶) (یعنی بسا اوقات تم کچھ چیزوں کو پسند نہیں کرتے لیکن وہ تمہارے لئے بہتر ہوتی ہیں، اور بہت سی چیزوں کو تم پسند کرتے ہو لیکن وہ تمہارے لئے بری ہوتی ہیں)

"وَلَا تُلْقُوْا بِأَیْدِیْکُمْ إِلَی التَّهْلُکَةِ" (سورہ بقرہ: ۱۹۵) کے تحت نفس وجان کی حفاظت ایک امر مامور بہ ہے، اور حفاظت نفس کے جمیع اسباب ووسائل کا اپنی وسعت کے مطابق فراہم کرنا ہر انسان پر لازم ہے، اس لئے شرعاً یہ بھی جائز نہیں ہوسکتا کہ وسعت کے ہوتے ہوئے کوئی ترک معالجہ کرکے موت کو دعوت دے، ہاں! ممکنہ علاج کے بعد صحت وشفاء سے بظاہر اسباب مایوس ہوکر یا وسائل کے فقدان کے سبب مجبوراً ترک معالجہ کرنا جائز ہوسکتا ہے، یا پھر "إنما الاعمال بالنیات" کے تحت رضا بالقضاء کے طور پر ترک معالجہ کی اجازت ہوسکتی ہے۔ اور بس، واللہ اعلم۔

مولانا عبدالرزاق صاحب، قاضی شریعت کٹیہار کی رائے قابل ملاحظہ ہے:

الجواب وباللّٰه التوفیق للصواب:

اس کا جواب حسب ذیل تین مقدموں پر موقوف ہے:

پہلا مقدمہ: خودکشی اور دوسرے کو قتل کرنا، دونوں کا ایک حکم ہے۔

دوسرا مقدمہ: کسی کو ناقابل برداشت کوئی تکلیف پہنچی اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے خودکشی کرلی یہ فعل ایسا ہی حرام ہے، جیسا کہ بلاوجہ خودکشی کرلینا حرام ہے۔

تیسرا مقدمہ: یہ کہ تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لئے بجائے خودکشی کے کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرنا جو منجر الی الموت ہو بحکم خودکشی کے ہے۔

پہلے مقدمہ کا ثبوت

مسلم شریف "کتاب الایمان باب بیان غلظ تحریم قتل الإنسان نفسه" **کی پہلی حدیث:** عن أبی هریرة قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: من قتل نفسه بحدیدة فحدیدته فی یده یتوجأ بها فی بطنه فی نار جهنم" ومن شرف سما فقتل نفسه (الحدیث)" **کے تحت (فتح الملہم :۱/۵۶۲) میں ہے:** "قوله فحدیدته فی یده، قال ابن دقیق العید: ... ویؤخذ منه أن جنایة الإنسان علی نفسه کجنایته علی غیره فی الإسلام، لأن نفسه لیست ملکا له مطلقا بل هی للّٰه تعالیٰ فلا یتصرف فیها إلا بما أذن فیه" **عبارت سے معلوم ہوا کہ اپنے کو قتل کرنا اور دوسرے کو قتل کرنا دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔**

اسی باب کی چھٹی حدیث: "عن أبی هریرة قال: شهدنا مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم حُنینًا فقال (علیه السلام) لرجل: ممن یدعی بالاسلام هذا من أهل النار فلما حضرنا القتال قاتل الرجل قتالا شدیدا فأصابته جراحة" **ساتویں حدیث میں ہے:** "فجرح الرجل جرحاً شدیداً فقیل یا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم! الرجل الذی قلت له: أنفًا أنه من أهل النار، فإنه قاتل الیوم قتالا شدیدًا وقدمات، فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: أی النار، فکاد بعض المسلمین أن یرتاب فبینما هم علی ذلك إن قیل: أنه لم یمت، ولکن به جراحاً شدیدًا، فلما کان من اللیل لم یصبر علی الجراح فقتل نفسه فأخبر النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: فقال: اللّٰه أکبر أشهد أنی عبد اللّٰه ورسوله. (الحدیث)"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی تکلیف سے نجات پانے کی غرض سے خودکشی حرام ہے، مذکور فی الحدیث شخص نے اپنی ناقابل برداشت تکلیف سے نجات پانے کیلئے ہی خودکشی کی تھی۔

مسلم شریف باب مذکور کی آٹھویں حدیث ہے: شیبان بن فرح کہتے ہیں: سمعت الحسن یقول: إن رجلاً ممن کان قبلکم خرجت به قرحة فلما آذته انتزع سهما من کنانته فنکأها فلم یرقأ حتی مات قال ربکم عزوجل: قد حرمت علیه الجنة ثم مد (الحسن) یده إلی المسجد فقال: ای واللّٰه لقد حدثنی بهذا الحدیث جندب عن

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم فی ھذا المسجد"

اس میں مذکور ہے کہ کسی کے پھوڑا نکلا تھا اس کی تکلیف سے نجات پانے کے لئے اس نے تیر کے نوک سے پھوڑے کو بہادیا، پھوڑے سے اتنا خون بہا کہ وہ مرگیا، اس سے ظاہر ہے اس نے خودکشی نہیں کی بلکہ ایسے فعل کا ارتکاب کیا جو اس کی موت کا ذریعہ بنا، براہ راست خودکشی نہ کرنے پر بھی خدا نے اس فعل کو خودکشی کا حکم دیا۔

دوسرے اور تیسرے مقدمہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ کسی کا اپنی شدید تکلیف سے نجات پانے کی غرض سے خودکشی کرنا اور بجائے خودکشی کے ایسے فعل کا ارتکاب کرنا جو اس کو موت تک پہنچادے، دونوں حرام ہیں۔

اور پہلے مقدمہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ خودکشی اور دوسرے کو قتل کرنا، دونوں کا ایک حکم ہے، لہٰذا ڈاکٹروں کا کسی ایسے مریض کو جس کے زندہ رہنے کی مظنون توقع نہ ہو، یا اس کی زندگی ڈاکٹروں کے ظنی علم کے مطابق محض ایک بوجھ ہو، اس کی شدید تکلیف سے نجات دلانے کے لئے ''یوتھینیز یا'' کی دونوں قسمیں مریضوں کو قتل کرنے کے حکم میں ہیں اور ڈاکٹر حضرات ان مریضوں کے قاتل شمار کئے جائیں گے۔

اس طرح مسئلہ یوتھینیز یا کا پہلا سوال حل ہوگیا کہ کسی مریض کو اس کی شدید تکلیف سے نجات دلانے کے لئے عمداً مریض کو موت تک پہنچادینے کی اجازت اسلام نہیں دیتا ہے۔

دوسرا سوال جس کا تعلق ''یوتھینیز یا یا پیسیو'' سے ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ مریض کی جان لینے کے لئے ''یوتھینیز یا ایکٹیو'' کی دونوں قسموں میں سے کوئی عملی تدبیر نہیں کی جاتی ہے؛ بلکہ اسے زندہ رکھنے کے لئے جو ضروری علاج کیا جانا چاہئے وہ نہیں کیا جاتا ہے، مثلاً کینسر، یا طویل بیہوشی، یا دماغی چوٹ، یا منجائٹس کا مریض جس کے زندہ رہنے کی توقع نہ ہو، یا وہ بچے جو شدید طور پر معذور ہوں جن کی زندگی خود ان کے لئے اور ان کے والدین کے لئے محض بوجھ ہو ایسے مریضوں کو ایک نیا قابل علاج مرض مثلاً: نمونیہ لاحق ہوگیا لیکن ڈاکٹر اس نمونیہ کا علاج نہ کرے تاکہ مریض آسانی سے مرجائے کیا اسلام اس مقصد کی خاطر نمونیہ کا علاج چھوڑ دینے کی اجازت دیتا ہے؟ اس کا جواب اس بات پر موقوف ہے کہ ڈاکٹروں کی ذمہ داری اور ان کا فرض منصبی متعین کیا جائے، ظاہر ہے کہ ڈاکٹروں کی ذمہ داری مریضوں کو بذریعہ معالجہ صحت یاب کرنا ہے، پس جب کوئی شخص اپنا نمونیہ والا مریض جو پہلے سے کینسر، دماغی چوٹ وغیرہ میں مبتلا تھا، ڈاکٹروں کے پاس لے گیا تو اب ڈاکٹروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نمونیہ کا علاج کریں، اس کے برعکس

ڈاکٹروں کا اس خیال سے نمونیہ کا علاج نہ کرنا تاکہ مریض جلد مرجائے اور کینسر کی شدید تکلیف سے نجات پائے، دودھاری تلوار ہے، نمونیہ کی نسبت سے اپنے فرض اور ذمہ داری سے گریز کرنا ہے، اور کینسر کی نسبت سے ایک ایسے (منفی) فعل کا ارتکاب کرنا ہے جو مریض کو موت تک پہنچادینے والا ہے، اور جو پہلے اور تیسرے مقدمہ کے مطابق مریض کو قتل کرنے کے حکم میں ہے، پس نمونیہ کا علاج نہ کرنا ''یوتھینیز یا پیسیو'' ہے اور ایکٹیو بھی، اس لئے اسلام اس علاج کے چھوڑ دینے کی اجازت دونوں وجوہ سے نہیں دیتا ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا تحریر فرماتے ہیں:

موت میں تعاون:

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے کائنات کی کسی شئی کا یہاں تک کہ خود اپنا مالک بھی نہیں ہے، اس لئے جس طرح اس کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی زندگی کے درپے ہو، اور اسے ہلاک کردے، یا اس کے جسم کو جزوی نقصان پہنچائے، اسی طرح یہ بات بھی روا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاک کرلے، اور کسی شرعی مصلحت کے بغیر اپنے کسی حصہ جسم ہی کو ضرر پہنچائے، اس کا جسم دراصل اس کے ہاتھوں میں اللہ کی امانت ہے، جس کی حفاظت اس کا فریضہ ہے، اور جس کا استعمال حکم خداوندی کے مطابق اس کو کرنے کی اجازت ہے، مگر اس نوعیت کا تصرف کسی طور پر جائز نہیں ہے۔

یہ طرز فکر بجائے خود اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ایسی مہلک دواؤں کا استعمال جائز نہ ہوگا، چنانچہ روایت میں ہے: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''من تردّی من جبل فقتل نفسه فهو فی نار جهنم یتردّی فیها خالدًا مخلدًا فیها ابدًا، ومن تحسّی سمًا فقتل نفسه فسمه فی یده یتحساه فی نار جهنم خالدًا مخلدًا فیها ابدًا، ومن قتل نفسه بحدیدة فحدیدته فی یده یتوجأ بها فی بطنه فی نار جهنم خالدًا مخلدًا ابدًا'' (مسلم مع فتح الملہم ۱/۲۶۵)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چاہے قتل کے لئے کسی آلۂ حادہ کا استعمال کیا جائے یا ''آتشیں اسلحہ'' کا یا کسی مشروب کا، ہر ایک خودکشی کے زمرہ میں آئے گا، اسی طرح وہ دوائیں جو جسم میں داخل ہوکر اعضاء کو کاٹ ڈالتی ہوں ''آلہ حادہ'' میں کسی خاص عضو کو اپنی حدت سے جلادیتی ہوں ''آتشیں اسلحہ'' میں، اور اس طرح کی تکلیف کے بغیر زہر بن کر ہلاک کردیتی ہوں،

جیسے بعض انجکشن اور دوائیں وغیرہ ''مشروب زہر'' میں شمار ہوں گی، اور حرام ہوں گی۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ حدیث میں عام حالات میں خودکشی سے منع کیا گیا ہوگا، لیکن اگر شدت اذیت کی وجہ سے محض ایک واقعی تکلیف سے بچنے کا ارادہ ہو تو مصلحتاً اس کی اجازت ہوگی، مگر دوسری احادیث نے اس مسئلہ کو بھی واضح کردیا ہے، چنانچہ حضرت جندب بن عبداللہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''کان فیمن کان قبلکم رجل به جرح فجرع فأخذ سکیناً فحزّبها یده فما رقأ الدم حتی مات قال اللّٰه تعالیٰ: بادرنی عبدی بنفسه فحرمت علیه الجنة''

خود عہد رسالت کا واقعہ حضرت جابرؓ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''إن الطفیل بن عمرو الدوسی لما هاجر النبی ﷺ إلی المدینة هاجر إلیه وهاجر معه رجل من قومه فمرض فجزع فأخذ مشاقص له فقطع بها براجمه فشخبت یداه حتی مات فرآه الطفیل بن عمرو فی منامه وهیئته حسنة ورآه مغطیا یدیه، فقال له: ما صنع بك ربك! فقال: غفرلی بهجرتی إلی نبیه ﷺ فقال مالی أراك مغطیا یدیك، قال: قیل لی: لن نصلح منك ما أفسدت فقصها الطفیل علی رسول اللّٰه ﷺ، فقال رسول اللّٰه ﷺ: اللهم ولیدیه فاغفر''

یہ تصریحات بتاتی ہیں کہ غیر معمولی جسمانی اذیت اور کلفت سے بچنے کے لئے بھی ایسا طرز عمل اختیار کرنا حرام ہے، اس کو آپریشن یا علاجاً بعض اعضاء کی تراش وخراش اور جسم سے قطع وبرید پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ کسی عضو کو علاجاً کاٹنے میں جسم کے دوسرے حصوں کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنا اور جان بچانا مقصود ہوتا ہے، اور اس اہم شرعی اور جسمانی مصلحت کے پیش نظر کمتر نقصان کو گوارا کرلیا جاتا ہے، جب کہ یہاں مقصود ہی ہلاک کرنا ہے، چنانچہ ایک غزوہ کے موقع سے ایک صحابی کا ہاتھ اس طرح کٹ گیا کہ چمڑا لگا ہوا تھا، اور ہڈیاں لٹک رہی تھیں، نیز اس کی وجہ سے مقابلہ میں دشواری پیش آرہی تھی انھوں نے اپنا ہاتھ کھینچ کر علیحدہ کردیا، اس عمل سے اپنے آپ کو ہلاک کرنا مقصود نہ تھا بلکہ اپنے آپ کو دفاع کے قابل بنانا تھا، جس میں ان کی جان کی حفاظت مضمر تھی، اس لئے یہ گویا جائز تھا۔ (باقی آئندہ)

❁ ❁ ❁